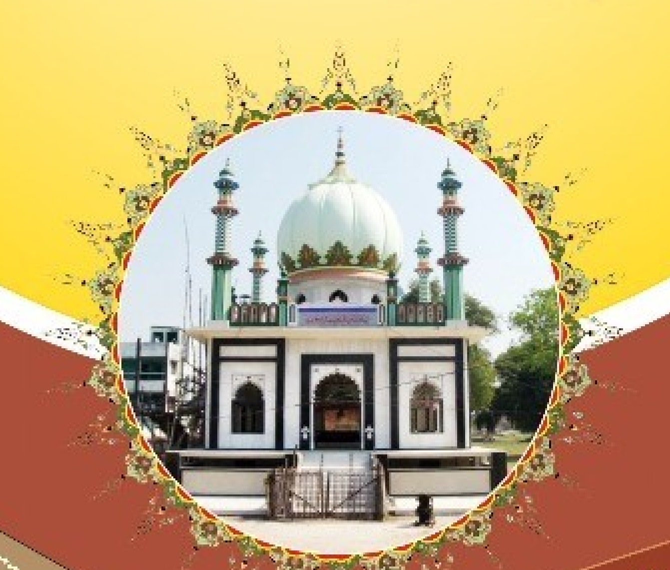


اہل سنت وجماعت کا ترجمان





دنیا بھر میں مسلمانوں کے قتل عام کی دل خراش داستان

فضائل صحابہ اور ممانعت؟
حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقب کا بیان کس نے منع کیا؟

دو قومی نظریہ کا آغاز وفروغ

حضور صدر الشریعہ کی تعلیم وتربیت کا نرالا انداز

فلسطین کیسے بنا اسرائیل؟

₹15/-





PAIGAM E SHARIAT

Monthly

JULY-2018  شوال المکرم و ذی قعدہ ۱۴۳۹ھ

ایک شمارہ کی قیمت 15 روپے، سالانہ قیمت: 150 بیرون ممالک کے لیے: 40 ڈالر خلیجی

طابع، ناشر، مالک محمد قاسم نے اعلیٰ پرنٹنگ پریس 3636 کٹرا دینا بیگ، لال کنواں، دہلی-6 سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ "پیغام شریعت" 442، سیکنڈ فلور، گلی سروتے والی، مٹیا محل جامع مسجد دہلی-6 سے شائع کیا۔



ماہنامہ پیغام شریعت دہلی

مکہ پبلیشر دہلی

گلی سروتے والی مکان نمبر ۴۴۲، دوسری منزل، مٹیا محل، جامع مسجد دہلی-۶

PAIGHAM E SHARIAT

Monthly

House No. 442, 2nd Floor, Gali Sarotey Wali,
Matia Mahal Jama Masjid Delhi-110006
Mob: 9911062519, 011-23260749
Email: paighameshariat@gmail.com

فہرست مضامین

{نوٹ}

اداریہ

فضائل صحابہ اور ممانعت؟

تیرہ سو سالہ تاریخ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت بیان کرنے سے کسی نے منع نہ کیا۔

تحریر: مفتی فیضان المصطفیٰ قادری (امریکہ)

یہ امت چہار جانب سے دشمنان اسلام کے حملوں کا شکار ہے۔ اعدائے دین مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادینے کے منصوبے تیار کر رہے ہیں، مگر یہ امت کسی بھی قیمت پر چھوٹے موٹے آپسی اختلافات کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہی ہے۔ کسی وجہ سے کوئی نزاعی کیفیت پیدا ہو جائے تو وہ ناسور بن جاتی ہے۔ اس کے حل کی طرف پیش قدمی بھی کی جاتی ہے تو وقار کا مسئلہ اس طرح آڑے آجاتا ہے کہ پھر کوئی مسئلہ کبھی حل نہیں ہو پاتا اور امت میں تقسیم در تقسیم ہوتی جاتی ہے۔

منتشر قوم کا یہی حال ہوتا ہے کہ اس کے کرنے کے کام محدود ہوتے جاتے ہیں، پھر وہ اندورنی معاملات میں زیادہ مصروف ہو جاتی ہے اور دیگر ضروری امور سے بالکل بے نیاز۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ واقعاتی تناظر میں کوئی کسی کو اپنا حریف مان لیتا ہے، پھر اس حریف کی کسی خوبی یا فضیلت کا ذکر اس کی قوت برداشت سے باہر ہوتا ہے، بلکہ حریف کے ذکر خیر کو اپنے محبوب کی ہتک سمجھ کر اسے اپنے لیے ایک چیلنج کے طور پر لیتا ہے۔

گزشتہ چند مہینوں سے صحابیِ رسول حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تعلق سے کچھ طبقے اُسی فتنے میں مبتلا ہو گئے جس سے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا۔ ہدایت تھی کہ میرے صحابہ کو محض بھلائی کے ساتھ یاد کرو، لیکن کچھ حلقوں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات کی پاس داری نہ ہو سکی۔

وہ امیر معاویہ جن کی پوزیشن ''خال المومنین''، یعنی امت کے ماموں کی ہے، جن کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے مجتہد اور فقیہ صحابیِ رسول قرار دیا، جن کو آقائے کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا کاتب مقرر فرمایا، اور ہادی و مہدی ہونے کی دعا فرمائی، اور جن سے امام حسن مجتبیٰ نے صلح فرما کر ان کو خلافت و امارت کی سند عطا کر دی۔ سچ فرمایا امام احمد رضا نے کہ ان پر اعتراض امام حسن مجتبیٰ بلکہ محبوب کبریا علیہ التحیۃ والثنا بلکہ خالق ارض و سما پر اعتراض ہے۔

بزرگوں کے مابین کوئی معاصرانہ چشمک یا نزاعی معاملہ ہوا ہو تو بعد والوں کو اسے بھلا دینا ہے، نہ کہ طعن و تشنیع کرنا۔ اس سلسلے میں شریعت اسلامیہ میں ہدایات موجود ہیں، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ گناہ کبیرہ ہے کہ بندہ اپنے والدین کو گالی دے، صحابہ نے عرض کی: کیا کوئی اپنے ماں باپ کو بھی گالی دیتا ہے؟ فرمایا ہاں، ایک شخص کسی کے باپ کو گالی دے تو وہ اس کے باپ کو گالی دے، اور کوئی کسی کی ماں کو برا کہے تو وہ بھی اس کی ماں کو برا کہے۔ (ترمذی عقوق الوالدین) اس حدیث پاک سے واضح ہے کہ تم کسی کو برا کہو جس کے جواب میں وہ تمہارے عزیز کو برا کہے یہ ایسا ہی ہے جیسے تم نے اپنے عزیز کو برا کہا۔

یہی ہدایت کسی معبودِ باطل کو برا کہنے کے متعلق بھی ہے جس کے جواب میں کوئی معبودِ برحق کی توہین کرنے لگے۔ خلاصہ یہ کہ ایک معزز کی حمایت میں دوسرے معزز کی گستاخی کرنا اسلامی تعلیمات کے منافی ہے، بلکہ اپنوں کے کمالات اور دوسروں کے عیوب پر نظر رکھنا فکری زوال کی علامت ہے، اور یہ ایسی بیماری ہے جس سے بہت کم لوگ بچ سکے ہیں، الا ماشاءاللہ تعالیٰ۔

اہل سنت و جماعت کا عقیدہ و معمول رہا ہے کہ ہم تمام صحابہ کرام اور تمام اہل بیت عظام سے محبت اور ان کا اکرام دینی فریضہ سمجھتے ہیں اور ان کے کسی باہمی تنازعہ یا مشاجرہ کو لے کر کسی کے خلاف ردو انکار برا سمجھتے ہیں۔ بلکہ علمائے امت نے مشاجرات صحابہ پر زبان کھولنے کو منع فرمایا،لیکن آج یہ حالت ہے کہ ہر کس و ناکس ،ایں قدر تا آں قدر جنگِ جمل و جنگِ صفین پر بیان بازی کرتا نظر آتا ہے۔ کچھ تاریخی کتابیں پڑھ کر کوئی بھی کسی صحابی کے خلاف اظہار آزادیٔ رائے کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔

اہل سنت کا طریقہ رہا ہے کہ تمام اکابر واسلاف کا ذکر پوری شوکت اور عزت واحترام سے کرتے ہیں۔ صحابہ واہل بیت میں جس کا بھی ذکر کسی نسبت سے آجائے تو ان کے فضائل ومناقب میں کاٹ چھانٹ نہیں کرتے ، بلکہ دل کھول کر ان کے کمالات اور عظمتوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور یہی صحت مند ماحول اور معتدل مزاج کی علامت ہے،مگر آج کل حالت یہ ہے کہ جو جس سلسلۂ عقیدت سے منسلک ہے اس کے علاوہ کسی اور کی خوبی سننا نہیں چاہتا، بلکہ دوسروں کے متعلق تاریخ وواقعات کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جرح ونقد کے لیے اپنی تمام تر ذکاوت کو بروئے کار لاتا ہے،لیکن وہی نقادطبیعت اپنے محبوب کے لیے اصولِ نقد کو ایک طرف کر دیتی ہے۔

حالانکہ انصاف پسندی یہ ہے کہ خوبیوں کا ذکر ہونا چاہیے اگر چہ کمزور دلیل سے ثابت ہوں اور عیوب کو نظر انداز کرنا چاہیے اگر چہ صحیح سند سے ثابت ہوں، تا کہ خیر پروان چڑھے اور شر منھ چھپاتا پھرے۔اسی لیے محدثین نے فضائل سے متعلق روایات میں تساہل سے کام لیا ،جس کے سبب فضائل سے متعلق روایات میں ضعاف کی کثرت پائی جاتی ، بلکہ ایسی کسی روایت کو شیخ البانی یا شیخ ابن تیمیہ موضوع بھی قرار دیں پھر بھی اس کو غیر معتبر نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ اگر امام ابن الجوزی نے بھی کسی روایت کو اپنی موضوعات میں درج کر دیا ہو، جب بھی ضروری نہیں کہ وہ روایت موضوع ہو، کہ ان حضرات کے نزدیک کسی روایت کو موضوع قرار دینے کا جو معیار ہے وہ مخدوش ہے،اس کے لیے امام ابن قتیبہ دینوری کی ''مختلف الاحادیث'' یا امام طحاوی کی ''مشکل الآثار'' دیکھنی چاہیے۔

یہ تو فضائل سے متعلق روایتوں کے بارے میں ہمارا ذوق ہے،لیکن منفی امور سے متعلق روایتوں پر خوب نقد و جرح اور چھان پھٹک ہونی چاہیے،اور ہر ایسی بات جس سے مسلمہ اکابر امت کی شان پر حرف آتا ہو اس کو نظر انداز کرنا چاہیے،خواہ وہ کتنی ہی صحیح سند سے کیوں نہ ثابت ہو،اور ایسی صحیح روایتوں سے سابقہ پڑے تو توجیہ وتاویل کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ اس طریقہ کار سے خیر کو فروغ ملے گا اور شر مات کھائے گا۔ بلکہ اصل میں صحابہ واہل بیت جیسی برگزیدہ شخصیات کی تعریف وتوصیف عقلاً ونقلاً ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، یہ لوگ سید المرسلین علیہ الصلاۃ والتسلیم سے نسبت کی بنیاد پر اپنی اصل میں خیر کے حاملین ہیں،لہٰذا ہلکی پھلکی روایت بھی اُسی خیر کو ثابت کرے گی جو اصلاً اُن کے لیے ثابت ہے،اور ان کا اصل مزاج شر وفساد سے گریز کرنا ہے، شر اُن کے قریب یا تو آتا ہی نہیں یا تقاضائے بشری سے آ گیا تو اُنھیں اُس پر قرار نہیں رہتا،اور جلد رجوع وانابت کی توفیق میسر ہوتی ہے۔لہٰذا ایسی بات کرنے سے کیا فائدہ جو اصلاً ان کے لیے ثابت نہیں بلکہ ان سے اجتناب ثابت ہے۔اصدق الصادقین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح الفاظ میں فرمایا اصحابی کلھم عدول: میرے تمام صحابہ عادل ہیں۔فن جرح وتعدیل میں یہ حدیث اصل الاصول مانی جاتی ہے ،لہٰذا ماہرین علم حدیث' طرقِ روایات اور اسانید پر خوب دادِ تحقیق دیتے ہیں اور جب سند مرتبہ صحابیت تک پہنچتی ہے اپنی تحقیق روک دیتے ہیں اور سند کی صحت کے لیے اسی قدر کافی قرار دیتے ہیں کہ راوی صحابی ہیں۔اب قول رسول ''اصحابی کلھم عدول'' کے عموم سے کسی ایک صحابی کو آخر کس دلیل سے مستثنیٰ کیا جائے گا؟

حبِ اہل بیت کے نام پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق آج کل ایک نیا شوشہ یہ چھوڑا گیا ہے کہ ان کے متعلق سکوت سے مراد ان کے فضائل ومناقب سے بھی سکوت ہے۔اس نظریہ کی بنیاد پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری نے رکھی ہے۔یہی نظریہ اس کے متبعین اور اعوان وانصار میں گشت کر رہا ہے، بلکہ اسی سے کچھ خانقاہی لوگوں نے بھی اسے قبول کرلیا ہے، جب کہ اس کی کوئی اصل نہیں۔

پروفیسر موصوف کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل ومناقب کا بیان تیرہ سو سال کے عرصے میں کہیں نظر نہیں آیا، حالانکہ عام کتبِ حدیث میں محدثین، صحابہ واہل بیت کے فضائل کے لیے کتاب المناقب قائم کرتے ہیں جس میں ان کے فضائل پر روایتیں ذکر کرتے ہوئے اپنی ترتیب پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل کی روایتیں بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس کے لیے انھیں دوبارہ صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

امام ابن حجر ہیتمی نے خلفائے راشدین اور اہل بیت کے ذکر پر مشتمل مشہور کتاب ''الصواعق المحرقۃ'' لکھنے کے بعد خاص حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ایک مستقل رسالہ لکھا جس کا نام ہے ''تطہیر الجنان واللسان عن الخطور والتفوہ بثلب سیدنا معاویۃ بن ابی سفیان۔ جس میں ان سے متعلق روایات جمع کر دی ہیں۔ اکابر امت کا طرزِ عمل رہا ہے کہ جب کبھی کسی معظم دینی کے خلاف مہم چلائی گئی تو ان کے دفاع میں تقریر وتحریر سے کام لیا گیا اور تالیفات منظر عام پر آئیں۔ خود سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق اسی سبب سے جو مستقل رسالے لکھے گئے، ان کی تعداد کافی سے زائد ہے، اور جو ضمنی ابواب باندھے گئے، ان کا شمار مشکل ہے۔ دیدۂ انصاف چاہیے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقب اور تذکروں کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں ان کے مناقب بیان کیے جارہے ہیں، بلکہ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مقامات کے بعد جس درجہ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا مقام آتا ہے اور جو فضائل ومناقب وارد ہوئے ہیں، ان کو آخر کیوں نظر انداز کیا جائے؟ ان دو بزرگوں کے مابین جو معاملات ہوئے، اس کے متعلق ہمیں سکوت اختیار کرنا ہے، لیکن جس طرح کوئی خارجی وناصبی حضرت امیر معاویہ کی طرف داری میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی کرے تو اس کا رد کیا جائے گا اور شانِ علی مرتضیٰ بیان کی جائے گی، اسی طرح کوئی رافضی شیعی حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی حمایت میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق بدکلامی کرے تو اس کا بھی رد کیا جائے گا، اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے واقعی فضائل اور کارنامے بیان کیے جائیں گے۔ یہی اعتدال اور انصاف کا تقاضا ہے، اب کوئی اسے شانِ مرتضوی کے مقابل تصور کرے تو اس بدگمانی کا علاج مشکل ہے۔

پروفیسر طاہر القادری نے شرح عقائد نسفیہ کا حوالہ دیا کہ جس میں ہے کہ

وبالجملة لم ينقل عن السلف المجتهدين والعلماء الصالحين جواز اللعن على معاوية واحزابه لان غاية امرهم البغي والخروج على الامام وهو لايوجب اللعن. (شرح العقائد صفحہ ۱۵۶) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلاف مجتہدین وعلمائے صالحین نے حضرت معاویہ اور ان کی جماعت پر لعن کو جائز نہیں قرار دیا کیوں کہ ان کا معاملہ امام برحق کے خلاف خروج وبغاوت کا بنتا ہے جس کی بنا پر لعن جائز نہیں۔ اس میں صراحتہً علامہ سعد الدین تفتازانی فرمارہے ہیں کہ ان پر لعن جائز نہیں، لیکن موصوف نے یہ مفہوم نکالا کہ ان کی فضیلت ومنقبت سے بھی کف لسان کیا جائے گا، نہیں معلوم مذکورہ عبارت سے یہ مفہوم کیسے نکلا۔ شرح عقائد کے مشہور حاشیہ ''نبراس'' میں علامہ عبدالعزیز فرہاری اس مقام پر فرماتے ہیں:

شارح علامہ سعد الدین تفتازانی نے اس صحابی (حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ) پر لعن کے عدم جواز پر اقتصار کیا ہے، یہ ان کے حق میں کم ہے، میں کہتا ہوں: محدثین نے صراحت کی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ عظیم اور مجتہد اکابر صحابہ سے ہیں، اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اصاغر صحابہ سے ہیں تو بھی شبہہ نہیں کہ وہ بھی ان صحیح احادیث کے عموم میں داخل ہیں جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اکرام واحترام میں وارد ہوئیں، بلکہ خاص ان کے حق میں کئی حدیثیں مثلاً: **اللّٰهُمَّ اجعله هاديا ومهديا وَاهْدِ بِهٖ** اور **اللهم علم معاوية الحساب والكتاب وقه العذاب** وارد ہوئیں، اور یہ کہنا محل نظر ہے کہ ان کی فضیلت میں کوئی حدیث ثابت نہیں۔ ان کو برا کہنے اور ان پر طعن کرنے پر اسلاف سخت ناراض ہوتے تھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا گیا کہ معاویہ وتر ایک رکعت پڑھتے ہیں تو انھوں نے فرمایا: انھیں

پڑھنے دو وہ فقیہ صحابی رسول ہیں۔ کسی نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے سامنے ان کو برا کہا تو آپ نے اس کو کوڑے لگائے، جب کہ کسی نے یزید کو امیر المومنین کہہ دیا تو اسے بھی کوڑے لگائے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ سے سوال ہوا کہ معاویہ افضل ہیں یا عمر بن عبدالعزیز؟ رضی اللہ عنہما۔ آپ نے فرمایا: حضرت معاویہ نے جس گھوڑے پر سوار ہو کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کیا اس گھوڑے کے قدموں کے غبار عمر بن عبدالعزیز سے افضل ہیں۔ امام قاضی عیاض مالکی نے شفا میں فرمایا: جو شخص ابو بکر و عمر و عثمان و معاویہ و عمرو بن العاص کسی صحابی کو برا کہے تو اگر یہ کہے کہ یہ کفر و ضلال پر تھے تو اسے قتل کر دیا جائے گا اور اگر کچھ اور برائی کرے تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔ علامہ عبدالعزیز فرہاری لکھتے ہیں کہ میں نے اس سلسلے میں ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے الناھیۃ عن ذم معاویۃ۔

(مترجماً نبراس علی شرح العقائد النسفیۃ صفحہ ۳۳۰)

خود علامہ تفتازانی نے شرح عقائد میں اسی مقام پر صحابہ کرام کے فضائل پر کئی روایتیں درج کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے صحابہ کرام کو ہمیشہ ذکر خیر کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ اور ان کی شان میں طعن و تشنیع سے سکوت کرنا ہے: ”**ویکف عن ذکر الصحابة الا بخیر لما ورد من الاحادیث الصحیحة في مناقبهم ووجوب الکف عن الطعن فیهم**“۔ (شرح العقائد ۱۵۵)

امام ابن دقیق العید نے اپنے عقائد میں لکھا کہ صحابہ کرام کے آپسی مشاجرات و اختلافات جو منقول ہوئے، ان میں کچھ تو وہ ہیں جو جھوٹ اور باطل محض ہیں، ان کی طرف التفات بیکار ہے، اور جو صحیح سند سے وارد ہیں ہم ان کی بہتر تاویل کرتے ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کی تعریف و تکریم فرما دی ہے، اور بعد کے معاملات مشکوک و موہوم ہیں جن کی تاویل کی جا سکتی ہے تو مشکوک و موہوم محقق و معلوم کو رد نہیں کر سکتا۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس خون سے ہمارے ہاتھوں کو محفوظ رکھا تو ہم اپنی زبانیں اس سے کیوں آلودہ کریں۔ (شرح الفقہ الاکبر بحوالہ حاشیہ شرح العقائد النسفیہ ۱۵۵)

بلکہ ائمہ مجتہدین تو فرماتے ہیں کہ اگر یہ منازعات نہ ہوتے تو ہمیں خروج علی الامام کا شرعی حکم حاصل نہ ہوتا۔ ہمارے اکابر کا مزاج تو یہ رہا ہے کہ شر سے بھی خیر کا پہلو نکال لیتے ہیں اور آج کے لوگوں کا مزاج یہ ہو گیا ہے کہ خیر میں بھی شر کا پہلو تلاش کرتے رہتے ہیں۔

امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے اس معاملے میں قول فیصل ارشاد فرمایا:

"بالجملہ ہم اہلِ حق کے نزدیک حضرت امام بخاری کو حضور پُر نور امام اعظم سے وہی نسبت ہے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور پُر نور امیر المومنین مولی المسلمین سیدنا و مولانا علی المرتضی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الاسنی سے، کہ فرقِ مراتب بے شمار اور حق بدست حیدر کرار، مگر معاویہ بھی ہمارے سردار، طعن اُن پر بھی کارِ فجار، جو معاویہ کی حمایت میں عیاذاً باللہ اسدُ اللہ کے سبقت و اوّلیت و عظمت و اکملیت سے آنکھ پھیرے وہ ناصبی یزیدی، اور جو علی کی محبت میں معاویہ کی صحابیت و نسبت بارگاہِ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) بُھلا دے وہ شیعی زیدی (ہے)، یہی روشِ آداب بحمداللہ تعالیٰ ہم اہلِ توسط و اعتدال کو ہر جگہ ملحوظ رہتی ہے: (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اَجمعین) (فتاوی رضویہ جلد 10 صفحہ 201)

اس اقتباس میں ہم سب کے لیے سیکھنے کو بہت کچھ ہے، اگر ہم سیکھنے کے لیے تیار ہوں۔ عام سی بات ہے کہ اپنے شیخ، مرشد اور محبوب شخصیات کے مناقب دل کی گہرائیوں میں اترتے جاتے ہیں، پھر نقاد طبیعتیں بھی سند یا متن پر نقد و جرح سے اِنکار کرتی ہیں۔ کیا برا ہو جائے گا اگر اسی مذاق و مزاج کا قدرے حصہ دیگر بزرگوں کے لیے بھی ہو۔ حضور اقدس محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے چمنستانِ رنگ و بو میں انواع و اقسام کے گل و لالہ ہیں۔ سارے پھولوں کی خوشبو چار دانگ عالم میں پھیلنی چاہیے۔ تمام بزرگوں اور دینی شخصیات کی یاد منانے اور ان کے احترام و اکرام کا خاص انتظام و اہتمام نہ ہو سکے تو کم از کم مناقب کا استقبال تو کیا جائے، اور دل میں اتنی بھی جگہ نہ ہو تو کم از کم آنکھیں بھنویں تو نہ چڑھائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہماری قوم کو وسعت ظرفی سے مالا مال فرمائے: آمین

اٹھارہویں قسط

مشکل احادیث اوران کا حل

از: مولانا کوثر امام قادری: مہراج گنج (یوپی)

نماز میں رفع یدین
(بحث دوم)

کتب صحاح ستہ میں ثبوت رفع یدین سے متعلق کل گیارہ صحابہ کرام کی روایات مذکور ہیں۔ ان میں سے تین صحابہ حضرت انس بن مالک، حضرت جابر بن عبداللہ حضرت عمیر بن حبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی روایتیں سنن ابن ماجہ میں ہیں۔ ان تینوں روایتوں کی سندیں انتہائی ضعیف ہیں، اس لیے وہ نقل نہ کی گئیں۔ یہاں صرف وہی روایتیں زیر بحث آئیں جن کی سندیں صحیح ہیں، یا ان میں ہلکا سا ضعف ہے۔ اب گیارہ میں سے کل آٹھ روایتیں باقی رہیں۔ ان آٹھ میں سے سات کا حال یہ ہے کہ ہر ایک صحابی سے باہم متعارض روایتیں کتب حدیث میں موجود ہیں۔ حضرت مالک ابن حویرث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کو امام بخاری ومسلم اور دیگر ائمہ صحاح نے تخریج کی ہے۔ ان سے صرف رفع یدین کی روایت ہے۔ آٹھ میں سے پانچ روایتیں بحث اول میں مرقوم ہوئیں۔ اب باقی تین روایت اور دفع تعارض بحث اخیر میں مذکور ہے۔

(۶) حضرت عبداللہ بن زبیر کی روایات

{عن ميمون المكي انه رأى عبد الله بن الزبير رضي الله عنه وصلى بهم يشير بكفيه حين يقوم وحين بركع وحين يسجد وحين ينهض للقيام فيقوم فيشير بيديه}
(سنن ابی داؤد جلد اول ۱۱۵)

ترجمہ: حضرت میمون مکی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو دیکھا اور ان کے ساتھ نماز پڑھی تو وہ اپنی ہتھیلیوں سے اشارہ کرتے جب کھڑے ہوتے، جب رکوع کرتے، جب سجدہ کرتے اور جب کھڑے ہونے لگتے۔ جب وہ کھڑے ہوجاتے تو اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرتے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما رکوع وسجود کے وقت رفع یدین کرتے تھے جب کہ ذیل کی روایت اس کے خلاف ہے۔

{عن محمد بن أبي يحيى قال: رايت عبد الله بن الزبير رضى الله عنه ورأى رجلا رافعا يديه يدعو قبل ان يفرغ من صلاته فلما فرغ منها قال: ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يكن يرفع يديه حتى يفرغ من صلاته} (معجم کبیر جلد ۱۳ ص ۱۰۲)

ترجمہ: حضرت محمد بن یحییٰ اسلمی فرماتے ہیں: میں حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ انھوں نے ایک آدمی کو دیکھا جو نماز سے فارغ ہونے سے قبل رفع یدین کر رہا تھا، جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو حضرت عبد اللہ نے فرمایا: بیشک حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رفع یدین نہیں کرتے تھے حتی کہ آپ نماز سے فارغ ہوجاتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ رکوع وسجود کے وقت رفع یدین کے قائل نہ تھے اور یہ واضح تعارض ہے کہ خود تو کریں اور دوسرے کی ممانعت کی روایت سنائیں۔

(۷)ابوحمید ساعدی کی روایات

{عن محمد بن عمرو بن عطاء قال سمعت ابا حميد الساعدي في عشرة من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم منهم ابو قتادة-قال ابو حميد انا اعلمكم بصلوٰة النبي صلى الله عليه وسلم قالوا،فلم؟ فو الله ماكنت اكثرناله تبعة ولا اقدمنا له صحبة قال: بلى، قالوا،فاعرض قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قام الى الصلوٰة يرفع يديه حتى يحاذى بهما منكبيه ثم يكبر حتى يقر كل عظم فى موضعه معتدلا ثم يقرأ ثم يكبر فيرفع يديه حتى يحاذى بهما منكبيه ثم يركع ثم يرفع راسه فيقول سمع الله لمن حمده ثم يرفع يديه حتى يحاذى بهما منكبيه ثم يقول الله اكبر ثم يهوى الى الارض فاذا قام من الركعتين كبر ورفع يديه حتى يحاذى بهما منكبيه ثم صنع مثل ذلک فى بقية صلوته قال فقالوا جميعا صدقت هكذا كان يصلى} (سنن ابی داؤد جلداول ص۱۱۳)

ترجمہ: حضرت محمد بن عطا بیان کرتے ہیں کہ میں نے دس اصحاب رسول کی موجودگی میں حضرت ابوحمید ساعدی سے سنا، جن میں حضرت ابوقتادہ بھی تھے۔ حضرت ابوحمید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں حضوراقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نماز کو آپ حضرات سے زیادہ جانتا ہوں۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم! یہ کس طرح ہے؟ جب کہ نہ آپ کو پیروی کرتے ہم سے زیادہ عرصہ گزرا اور نہ آپ نے صحبت کا شرف ہم سے زیادہ پایا۔ انھوں نے کہا: بات تو یہی ہے۔ سب نے کہا بیان تو کیجیے۔ انھوں نے کہا: حضرت رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے، یہاں تک کہ وہ کندھوں کے برابر ہو جاتے، پھر تکبیر کہتے، پھر قرأت کرتے، پھر تکبیر کہتے، پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھاتے، پھر رکوع کرتے، پھر سر مبارک اٹھاتے اور سمع اللہ لمن حمدہ کہتے، پھر دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے بالمقابل اٹھاتے، پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے زمین کی طرف جھکتے، پھر جب دو رکعتوں کے بعد کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے اور دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھاتے، پھر اپنی باقی نماز میں اسی طرح کرتے۔ راوی کا بیان ہے کہ تمام موجود صحابہ نے فرمایا: تم نے سچ کہا: حضوراقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایسے ہی نماز پڑھتے تھے۔

توضیح: یہ حدیث انتہائی ضعیف ہے،اوراس میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ اس حدیث کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا: اصلہ فی البخاری (الدرایہ جلداول ۱۵۳)

اس حدیث سے پتہ چلا کہ ابوحمید ساعدی کے نزدیک رکوع کے وقت رفع یدین ہے جب کہ ان ہی کی اصل روایت اس کے خلاف ہے۔

حضرت محمد بن عطا بیان کرتے ہیں کہ وہ حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، پھر حضوراقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نماز کا ذکر آیا تو ابوحمید ساعدی نے کہا۔ میں تم سب میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو خوب یاد رکھنے والا ہوں۔ میں نے دیکھا: آپ جب تکبیر تحریمہ کہتے تو اپنے دونوں ہاتھ دونوں کندھوں کے برابر لے جاتے اور جب رکوع کرتے تو اپنے دونوں ہاتھ دونوں گھٹنوں پر جما دیتے پھر اپنی پیٹھ جھکا کر سر اور گردن کے برابر کر دیتے، پھر سر اٹھا کر سیدھے کھڑے ہو جاتے۔ آپ کی پیٹھ کی ہر پسلی اپنی جگہ پر آجاتی اور جب سجدہ کرتے تو دونوں ہاتھ زمین پر رکھتے، نہ بانہوں کو بچھاتے اور نہ سمیٹ کر پہلو سے لگاتے اور پاؤں کی انگلیوں کی نوکیں قبلہ کی طرف رکھتے اور جب دو رکعتیں پڑھ چکے ہوتے تو بایاں پاؤں بچھا کر اسی پر بیٹھتے اور

داہنا پاؤں کھڑا رکھتے اور جب اخیر رکعت پڑھ چکے ہوتے تو بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھتے اور داہنا پاؤں کھڑا رکھتے اور سرین کے بل بیٹھتے۔(صحیح بخاری: جلد اول ص ۱۱۴)

توضیح: اس حدیث میں رکوع وسجدہ کے وقت رفع یدین کا کوئی ذکر نہیں اور یہی اصل روایت ہے جو صحیح ہے۔

(۸) حضرت مالک بن حویرث کی روایات

{عن مالک بن الحویرث رضی اللّٰه عنه ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کان اذا کبر رفع یدیه حتی یحاذی بهما اذنیه واذا رفع راسه من الرکوع فقال سمع اللّٰه لمن حمده فعل مثل ذلک}

(صحیح بخاری: جلد اول ص ۱۰۲- صحیح مسلم)

ترجمہ: حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب اللہ اکبر کہتے تو ہاتھوں کو کانوں کے بالمقابل اٹھاتے، اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو سمع اللہ لمن حمدہ فرماتے اور اسی طرح رفع یدین کرتے۔

یہی روایت نسائی شریف میں اس طرح ہے۔

{عن مالک بن الحویرث رضی اللّٰه عنه انه رأی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم رفع یدیه فی صلاته اذا رکع واذا رفع راسه من الرکوع واذا سجد واذا رفع راسه من السجود حتی یحاذی بهما فروع اذنیه} (سنن نسائی: جلد اول ص ۱۲۳)

ترجمہ: حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں: انھوں نے دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی نماز میں دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے جب رکوع کرتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے اور جب سجدہ کرتے اور سجدہ سے سر اٹھاتے، یہاں تک کہ دونوں ہاتھ کانوں کی لو کے برابر ہو جاتے۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ رکوع وسجود کے وقت رفع یدین کرنا چاہیے جب کہ اس کے خلاف دوسرے صحابہ کرام کی حسب ذیل روایتیں ہیں۔

{عن البراء رضی الله عنه ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کان اذا افتتح الصلٰوة رفع یدیه الی قریب من اذنیه ثم لایعود} (سنن ابی داؤد جلد اول ۱۰۹)

ترجمہ: حضرت برا ابن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو کانوں کے قریب تک ہاتھوں کو اٹھاتے تھے، پھر نہیں اٹھاتے تھے۔

{عن علقمة رضی اللّٰه عنه قال قال عبد اللّٰه بن مسعود رضی اللّٰه عنه الا اصلی بکم صلٰوة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فصلی قلم یرفع یدیه الا فی اول مرة}

(سنن ترمذی ۲۴ رنسائی شریف جلد اول ۱۲۰)

ترجمہ: حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: کیا میں تم کو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نماز نہ پڑھاؤں، پھر انھوں نے نماز پڑھائی اور صرف پہلی بار رفع یدین کیا۔

حل اشکال

اس باب میں مروی دونوں قسم کی روایتیں ذکر کی گئی ہیں جن میں باہم تعارض ہے۔ یہاں خصوصیت کے ساتھ صرف دو قسم کے تعارضات کے حل کی کوشش کی گئی ہے۔

حل اول: سات صحابہ کرام حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت وائل بن حجر، حضرت ابو حمید ساعدی، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبد اللہ بن عباس وحضرت عبد اللہ بن زبیر نے دونوں قسم کی روایتیں بیان کی ہیں یعنی ان سے ثبوت رفع یدین اور ترک رفع یدین کی متعارض روایتیں موجود ہیں۔ اس پر یہ سوال ہوتا

ہے کہ ان میں کون لائق قبول ہیں اور کون رد کیے جانے کی مستحق ؟ان کا اپنا عمل اپنی روایت کے خلاف ہے تو ترجیح عمل کو ہے یا ان کی روایت کو؟ یا دونوں پر عمل ہو، یا دونوں کو رد کر دیا جائے؟ بلا کسی معقول وجہ کے صرف تعارض کی بنیاد پر دونوں کو رد کر دیا جائے، یہ غیر دانشمندانہ حرکت وعمل ہے، اور دونوں پر عمل ہو، یہ ناممکن سی بات ہے۔ بعض کو قبول کریں اور بعض کو ترک کریں، یہ اچھی صورت ہے، لیکن اس پر یہ سوال ہے کہ کس کو لیا جائے اور کس کو ترک کیا جائے؟

اگر ثبوتِ رفع یدین کی روایتوں کو لیتے ہیں اور اس کی بنیاد پر رکوع وسجود کے وقت رفع یدین کے استحباب ومسنونیت کا قول کرتے ہیں تو اس پر سوال ہوگا کہ جن صحابہ نے ترک رفع یدین کیا، وہ بالقصد مخالفت اتباع مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتکب ہوئے اور یہ بداھۃً باطل ہے۔

اگر ترک رفع یدین کی روایتوں کو لیا جائے تو اس پر بھی یہی اعتراض وارد ہوگا کہ انھوں نے رفع یدین کیوں کیا؟ کیا یہ خلاف سنت وخلاف روایت نہیں ہے؟

اس کا جواب صاف اور واضح ہے کہ یہ دونوں امور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہلے رکوع وسجود کے وقت رفع یدین کیا تو صحابہ نے بھی کیا، پھر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ترک فرما دیا تو صحابہ نے بھی ترک کر دیا۔

یہ تو عمل کی بات رہی۔ جب روایت بیان کرنے کی بات آتی ہے تو چونکہ دونوں باتیں معلوم تھیں، اس لیے دونوں بیان کر دیا۔

گویا ثبوت رفع یدین کی روایتوں کو نسخ سے پہلے کے زمانے پر محمول کیا جائے اور ترک رفع یدین کی روایتوں کو بعد نسخ کے زمانہ پر محمول کیا جائے، یعنی ثبوت رفع یدین کی ساری روایتیں منسوخ ہیں اور ان کے لیے ناسخ حسب ذیل روایت ہے۔

{عن جابر بن سمرة رضی اللّٰه عنه قال: خرج علینا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فقال: ما لی اراکم رافعی ایدیکم کانها اذناب خیل شمس اسکنوا فی الصلوة} (صحیح مسلم: جلد اول ص ۱۸۱)

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: کیا وجہ ہے کہ میں تم کو سرکش گھوڑوں کی دموں کی طرح رفع یدین کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

دوسرا تعارض اس میں یہ ہے کہ بخاری ومسلم نے حضرت مالک بن حویرث کی روایت ثبوت رفع یدین پر پیش کیا اور امام نسائی وامام ترمذی نے ترک رفع یدین پر حضرت براء بن عازب اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کی روایت پیش کی اور ان دونوں میں تعارض ہے، اس کا حل ملاحظہ کریں۔

جب روایات مرفوعات میں باہم تعارض ہو جائے تو رفع تعارض کے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ صحابہ کا عمل کس پر ہے اور جب صحابہ کرام کے عمل میں اختلاف ہو تو یہ معاملہ پھر لوٹ کر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پہنچے گا اور وہاں سے جو رہنمائی ملے گی، اس کے مطابق ترجیح کا عمل جاری ہوگا۔

قرآن شریف میں ہے: **{فان تنازعتم في شيء فرُدُّوه الی اللّٰه والرسول ان کنتم تؤمنون باللّٰه والیوم الأخر ذلک خیر واحسن تاویلا}** (سورہ نسا: آیت نمبر ۵۸) اس فرمان الٰہی کے بموجب بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ رہنمائی ملی۔

{عن العرباض بن سارية رضي اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: فعلیکم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوا بها وعضوا علیها

بالنواجذ}(مشکوٰۃ المصابیح ص۳۰)

خلفائے راشدین میں مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔ اگر ان کے عمل میں تعارض سمجھ میں آئے تو اس کے حل کے لیے شیخین کریمین کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے **{عن حذيفة رضي الله عنه قال قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم: اني لا أدرى ما بقائي فيكم فاقتدوا بالذين من بعدى أبي بكر وعمر رضي اللّٰه عنهما}**(مشکوٰۃ المصابیح ص۵۶۱)

حضرت امام مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

{اذا جاء عن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم حديثان مختلفان وبلغنا ان ابابكر وعمر عملا باحد الحديثين وتركا الأخر كان في ذلك دلالة ان الحق فيما عملا به}(التمھید جلد۳؍۳۵۳)

بات جب یہاں تک پہنچ گئی کہ متعارض روایتوں میں ترجیح کا عمل حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے عمل کی روشنی میں جاری ہوگا تو اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ انھوں نے رکوع وسجود کے وقت رفع یدین کیا یا نہیں؟ اس سلسلے میں حسب ذیل روایتیں ہیں۔

{عن علقمة رضى اللّٰه عنه عن عبد اللّٰه بن مسعود رضى اللّٰه عنه قال صليت مع النبي صلى اللّٰه عليه وسلم ومع ابى بكر ومع عمر رضى اللّٰه عنهما فلم يرفعوا ايديهم الاعند التكبيرة الاولىٰ فى افتتاح الصلوٰة} (السنن الکبریٰ للبیہقی جلد۲؍ص۸۰)

ترجمہ: حضرت علقمہ کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں نے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اقتدا میں نماز پڑھی۔ یہ سب لوگ نماز کے شروع میں صرف پہلی تکبیر کے وقت رفع یدین کرتے تھے۔

{عن الاسود رضى اللّٰه عنه قال: رأيت عمر بن الخطاب رضى اللّٰه عنه يرفع يديه فى اول مرة ثم لايعود ورايت ابراهيم والشعبى يفعلان ذلك}

(شرح معانی الآثار جلد اول ۱۳۳)

ترجمہ: حضرت اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ وہ صرف پہلی بار رفع یدین کرتے تھے، پھر نہیں کرتے تھے اور امام ابراہیم وامام شعبی بھی اس طرح کرتے تھے۔

شیخین کریمین کے عمل نے فیصلہ کردیا کہ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت مرجوح اور ناقابل عمل ہے اور حضرت برا بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت راجح اور قابل قبول وعمل ہے، اور یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت وعمل کو اپنانے میں ڈھیر ساری بھلائیاں ہیں، چنانچہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل کوفہ کے مطالبہ پر باشندگان کوفہ کو تعلیم وتربیت کے لیے حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو بھیجا تو یہ فرمان جاری کیا۔

{فاقتدوا بهما واسمعوا من قولهما قد آثرتكم بعبد اللّٰه بن مسعود علىٰ نفسي}(تذکرہ الحفاظ جلد اول ص۱۴)

ترجمہ: تم لوگ ان دونوں کا اتباع کرو اور ان کی بات مانو، بیشک میں نے عبداللہ بن مسعود کو تمہارے یہاں بھیج کر تمہیں اپنی ذات پر ترجیح دی ہے۔

توضیح: مذکورہ بالا مباحث سے واضح ہوگیا کہ رفع یدین صرف تکبیر اولیٰ کے وقت ہے۔ باقی اوقات میں رفع یدین سے متعلق روایات منسوخ ہیں: واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

☆☆☆

چالیس احادیث کا حفظ اور اس کی فضیلت

مفتی ازہار احمد امجدی ازہری: فاضل حدیث (مصر)

چالیس احادیث کو یاد اور ان کو محفوظ کر کے امت تک پہنچانے کی فضیلت احادیث میں کثرت سے وارد ہے۔ اسی طرح کسی تعداد کی قید کے بغیر فرامین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی احادیث طیبہ کو بیان کرنے اور ان کو لوگوں تک پہنچانے کی ترغیب دلائی گئی ہے، اسی وجہ سے سیکڑوں متقدمین ومتاخرین علمائے کرام علیہم الرحمۃ والرضوان نے ان احادیث پر اعتماد کرتے ہوئے چالیس احادیث پر مشتمل بے شمار کتابیں تصنیف فرمائیں۔

آج بھی ان احادیث کے پیش نظر یا علمائے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس باب میں کتابیں لکھی جارہی ہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ تا قیامت لکھی جاتی رہیں گی۔ میں اختصار کے ساتھ اپنی اس گفتگو میں پہلے چالیس احادیث کی حفاظت ،صحت وضعف کے اعتبار سے ان احادیث کی حیثیت اور ان کے فضائل کے ثبوت پر گفتگو کروں گا۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے، **وما توفيقي إلا بالله عليه توكلت وإليه أنيب**

حدیث: **((من حفظ على أمتي أربعين حديثا))** کو تیرہ صحابہ کرام نے روایت کیا ہے (العلل المتناھیۃ فی الأحادیث الواھیۃ/ابن الجوزی رحمہ اللہ، ج۱ص۱۱۲، ط: ادارۃ العلوم الأثریۃ، فیصل آباد، پاکستان) مگر کوئی روایت علت قادحہ سے خالی نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''پھر میں نے اس حدیث کی روایات وطرق کو ایک جز میں جمع کیا، ان میں سے کوئی بھی طریق علت قادحہ سے محفوظ نہیں'' (التلخیص الحبیر/ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ، ط: دار الکتب العلمیۃ)

میں ان میں سے یہاں پر تین ایسی روایتوں کو ذکر کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جن کے راویوں پر ان تمام روایات میں سے سب سے کم درجے کا کلام کیا گیا ہے، یعنی انہیں ضعیف قرار دیا گیا یا یہ کہا گیا ہے کہ یہ راوی قابل احتجاج نہیں یا متروک سے متصف کیا گیا ہے۔ احادیث ملاحظہ فرمائیں:

پہلا طریق: **عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: ((من حفظ على أمتي أربعين حديثا مما ينفعهم الله به في أمر دينهم بعثه الله عز وجل يوم القيامة فقيها عالما وكنت له شفيعا وشهيدا))** (العلل المتناھیۃ فی الأحادیث الواھیۃ/ابن الجوزی رحمہ اللہ، ج۱ص۱۱۲، رقم: ۱۶۷)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((جس نے میری امت کے لیے چالیس احادیث ایسی محفوظ کرلی جو ان کے دین کے معاملہ میں انہیں نفع بخش ہو، اللہ تعالیٰ عزوجل اسے قیامت کے دن فقیہ عالم اٹھائے گا اور میں اس کی شفاعت کرنے والا اور گواہ رہوں گا))

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث کے اس طریق میں محمد بن یزید اور یزید بن سنان ہیں۔ حافظ ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت مظلم ہے، امام دارقطنی رحمہ اللہ نے محمد بن یزید بن سنان اور ان کے والد کو ضعیف قرار دیا ہے، اور یحییٰ نے فرمایا: یزید لیس بشیء۔ امام نسائی نے فرمایا: متروک''۔ (العلل المتناھیۃ فی الاحادیث الواھیۃ/ابن جوزی رحمہ اللہ، ج۱ص۱۱۲)

دوسرا طریق: **عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: ((من حفظ على أمتي أربعين حديثا من سنتي أدخلته يوم القيامة في شفاعتي))** (معجم ابن

عساکر، ج ا ص ۵۸۰، رقم: ۱۵۷، ط: دار البشائر، دمشق)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ کہتے ہیں: میں نے حضور اقدس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس نے میری سنت سے میری امت کے لیے چالیس احادیث یاد کرلی، میں اسے قیامت کے دن اپنی شفاعت میں داخل کروں گا۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے اس طریق میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن معاویہ ہیں، ان کے بارے میں یحییٰ نے فرمایا: ''ان کی حدیث سے احتجاج نہیں کیا جائے گا'' (العلل المتناھیۃ فی الاحادیث الواھیۃ رابن جوزی رحمہ اللہ، ج ا ص ۱۱۲) اور وہابیوں کے امام ناصر الدین البانی نے بھی اس روایت کو صرف ضعیف ہی قرار دینے پر اکتفا کیا ہے (ضعیف الجامع الصغیر و زیادتہ، رقم: ۵۵۶۱، ط: المکتب الاسلامی)

((عن أنس رضي اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وآله وسلم: من حفظ على أمتي أربعين حديثا مما يحتاجون اليه من الحلال والحرام كتبه اللّٰه فقيها عالما)) (العلل المتناھیۃ فی الأحادیث الواھیۃ رابن الجوزی رحمہ اللہ، ج ا ص ۱۱۲، رقم: ۱۸۰)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے میری امت کے لیے ایسی چالیس احادیث کی حفاظت کی، جن کے وہ محتاج ہیں یعنی حلال وحرام؛ تو اللہ تعالیٰ اسے فقیہ عالم لکھ دے گا۔

حافظ ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیث کے پہلے طریق میں حفص بن جمیع ہیں، ان کے بارے امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خطا کرتے تھے، یہاں تک کہ حدود احتجاج سے نکل گئے، اور اس روایت میں ابان راوی، متروک ہیں'' (العلل المتناھیۃ فی الاحادیث الواھیۃ رابن جوزی رحمہ اللہ، ج ا ص ۱۱۲)

اس حدیث کے بارے میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حفاظ کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس حدیث کے طرق زیادہ ہونے کے باوجود یہ حدیث ضعیف ہے۔ علمائے کرام رضی اللہ عنہم نے اس باب میں لاتعداد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ میرے علم کے مطابق اس باب میں سب سے پہلے تصنیف فرمانے والے عبد اللہ بن مبارک ہیں۔ ان کے بعد عالم ربانی محمد بن اسلم طوسی، حسن بن سفیان نسائی، ابوبکر آجری، ابوبکر بن ابراہیم اصفہانی، دارقطنی، حاکم، ابونعیم، ابوعبدالرحمٰن سلمی، ابوسعید مالینی، ابوعثمان صابونی، عبد اللہ بن محمد انصاری، ابوبکر بیہقی اور متقدمین ومتاخرین میں سے بے شمار علما نے اس باب میں کتابیں تصنیف فرمائیں، میں نے ان ائمہ، اَعلام اور حفاظ اسلام کی اقتدا کرتے ہوئے چالیس احادیث جمع کرنے کے لیے استخارہ کیا، اور علمائے کرام کا فضائل اعمال میں حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے جواز پر اتفاق ہے۔ اس کے باوجود میرا اعتماد اس حدیث پر نہیں، بلکہ احادیث صحیحہ میں موجود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان اقوال پر ہے: **((ليبلغ الشاهد منكم الغائب))** ترجمہ: چاہئے کہ تم میں سے جو حاضر ہو وہ غائب کو پہنچائے۔ (صحیح البخاری، باب لیبلغ العلم الشاھد الغائب، ج ا ص ۳۳، رقم: ۱۰۵، ط: دار طوق النجاۃ) دوسرا فرمان ہے: **((نضر اللٰه امرأ سمع مقالتي فوعاها فأداها كما سمعها))** ترجمہ: اللہ تعالیٰ اس شخص کے چہرے کو روشن فرمائے جس نے میری بات سنی، اس کو یاد رکھا، پھر جس طرح اس نے بات کو سنا، اسی طرح دوسروں تک پہنچایا۔ (مسند أحمد، ج ۲۷ ص ۳۰۱، رقم: ۱۶۷۳۸)

پھر علمائے کرام میں سے بعض نے اصول دین، بعض نے فروع، بعض نے جہاد، بعض نے زہد، بعض نے آداب اور بعض نے خطاب میں چالیس احادیث کا مجموعہ تصنیف فرمایا اور سب کے مقاصد نیک وصالح ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو.....الخ'' (الأربعون النوویۃ رامام نووی رحمہ اللہ، ص ا، ط: دار المنھاج، لبنان)

امام نووی رحمہ اللہ کے اس کلام سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) چالیس احادیث کی فضیلت کے متعلق کثرت سے احادیث وارد ہیں (۲) تعدد طرق کے باوجود بھی سب احادیث ضعیف ہیں، یعنی کوئی حدیث اس قابل نہیں کہ کوئی دوسری حدیث اسے تقویت

دے اور وہ ضعیف سے ترقی کر کے حسن لغیرہ یا صحیح لغیرہ ہو جائے (۳) حافظ عبداللہ بن مبارک جیسے عظیم عالم اور بے شمار علما نے اس باب میں لاتعداد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں (۴) علمائے کرام رضی اللہ عنہم کا باب فضائل میں حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے جواز پر اتفاق ہے؛ اس لیے اس باب کی احادیث ضعیفہ پر اعتماد کرتے ہوئے ان میں وارد شدہ فضیلت کو حاصل کرنے کے لیے کتاب لکھنا جائز و درست ہے (۵) لیکن خود امام نووی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب: 'الأربعون النووية' ان احادیث کے پیش نظر نہیں بلکہ علمائے سابقین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اور دوسری صحیح احادیث پر اعتماد کرتے ہوئے تصنیف فرمائی (۶) علمائے کرام رضی اللہ عنہم نے 'الأربعون' کسی خاص باب میں نہیں، بلکہ مختلف ابواب میں تصنیف فرمائی۔

حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''چالیس احادیث کے متعلق فضیلت والی حدیث حضرت علی، حضرت عمر اور حضرت انس رضی اللہ عنہم وغیرہ سے متعدد اسانید کے ذریعہ مروی ہے، مگر سب میں مقال ہے۔ اس میں سے کسی ایک کی بھی تصحیح کی گنجائش نہیں، لیکن کثرت طرق اس حدیث کو تقویت بخشتی ہے اور ان میں سب سے اجود و عمدہ طریق حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ہے، اگرچہ وہ بھی ضعیف ہے'' (فیض القدیر شرح الجامع الصغیر/عبد الرؤف بن تاج مناوی رحمہ اللہ، ج ۶ ص ۱۱۸، رقم: ۱۲۳۳۵، ط: المکتبة التجارية الکبری، مصر)

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چالیس احادیث کے متعلق ساری احادیث موضوع ہیں، ان کا یہ سمجھنا غلط ہے، اکثر شدید ضعیف یا ایک مذہب کے اعتبار سے موضوع اور بعض صرف ضعیف ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا بعض اقوال اور کتاب: 'العلل المتناهية في الأحاديث الواهية' کی بحث سے واضح ہے۔

تعریف حدیث متواتر: وہ حدیث ہے جس کو شروع سے آخری سند تک ایسے لوگوں نے نقل کیا ہو جن کے صدق کا علم بدیہی طور پر حاصل ہو، یعنی اتنے لوگ ہوں کہ ان کا جھوٹ پر متفق ہونا ممکن نہ ہو۔ حدیث متواتر کا حکم: ایسی حدیث پر اس کے رجال سے متعلق بحث کیے بغیر عمل کرنا واجب ہے (تدریب الراوی/جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ، ج ۲ ص ۶۲۷، النوع الثلاثون، ط: دار طيبة)

ہر طبقہ میں کتنے راوی حدیث روایت کریں تو وہ حدیث متواتر ہوگی، اس کے بارے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔ ان کے اقوال مندرجہ ذیل ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

(۱) اصح یہ ہے کہ اس کے متعلق کوئی تعداد متعین نہیں (۲) ہر طبقہ میں چار راوی کا ہونا کافی نہیں، البتہ اس سے زیادہ ہو تو صالح ہے اور پانچ میں توقف ہے (۳) اس کی اقل مقدار دس ہے، یہی مختار ہے، کیوں کہ یہی جمع کثرت کا پہلا درجہ ہے (۴) نقبائے بنی اسرائیل کے مطابق بارہ کی تعداد ہے (۵) بیس ہونی چاہیے (۶) چالیس ہونی چاہیے (۷) اصحاب موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کے مطابق ستر ہونی چاہیے (۸) اصحاب طالوت اور اہل بدر کی تعداد کے مطابق تین سو تیرہ ہونی چاہیے (تدریب الراوی/جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ، ج ۲ ص ۶۲۷، النوع الثلاثون، ط: دار طيبة)

خاتم الحفاظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے پہلے اپنی کتاب: 'الأزهار المتناثرة في الأخبار المتواترة' تصنیف فرمائی، پھر اس کی تلخیص کر کے اس کا نام: 'قطف الأزهار' تجویز فرمایا۔ آپ نے اپنی اس کتاب کو ہر طبقہ میں دس راویوں یا اس سے زیادہ موجود ہونے کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے، اس لحاظ سے امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی اس کتاب کو مرتب کرنے میں تیسرے قول مختار کو ترجیح دی ہے۔ اگر خاتم الحفاظ رحمہ اللہ کے اس ترجیحی پہلو کو پیش نظر رکھا جائے؛ تو کہا جا سکتا ہے کہ چالیس احادیث کے متعلق فضیلت والی حدیث متواتر ہے؛ کیوں کہ اس حدیث کے رایوں میں صحابہ کرام دس سے زائد ہیں اور دیگر طبقات میں بھی راوی دس سے کم نہیں، اس لیے اس حدیث کو متواتر کہا جانا چاہیے اور اس حدیث کے راویوں کی تفتیش کے بغیر اس حدیث کو قابل قبول و عمل سمجھا جانا چاہیے، کیوں کہ حدیث متواتر کو قبول کرنے کے لیے اس کے رجال کی تفتیش کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی، کیوں کہ ان سب راویوں کا جھوٹ پر اتفاق ممکن نہیں ہوتا۔

بہرصورت چالیس احادیث کے متعلق جو فضیلت آئی ہے،

اس کو یا محض حدیث پہنچانے کا ثواب حاصل کرنا مرغوب ومحبوب ہے، خواہ اس اعتبار سے کہ احادیث ضعیفہ فضائل کے باب میں معتبر ہیں یا اس لحاظ سے کہ لاتعداد علمائے کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس باب میں بے شمار کتابیں تصنیف فرمائی ہیں یا اس اعتبار سے کہ یہ حدیث متواتر ہے، اور حدیث متواتر اعلی درجہ کی قابل قبول وقابل عمل حدیث ہوتی ہے۔

حدیث مذکور کی فضیلت میں شمولیت

علامہ مناوی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں: ''چالیس احادیث یاد کرنے والے سے مراد وہ شخص ہے جس نے تخریج واسناد کے ذریعہ چالیس احادیث، احادیث صحیحہ یا حسنہ امت تک پہنچایا، بعض لوگوں نے کہا: احادیث ضعیفہ جو فضائل کے باب میں مقبول ہیں، ان کو امت تک پہنچایا، بعض لوگوں نے جرح وقدح سے محفوظ ہونے کی بھی شرط لگائی ہے، نیز احادیث کا ابواب علم کے کسی خاص باب سے ہونا ضروری نہیں، بلکہ احادیث احکام اور احادیث رقائق وغیرہ سے بھی ہوسکتی ہیں''۔

احادیث کس باب کی ہوں، اس کے بارے میں علما کا اختلاف ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''اور جس نے بھی ان اقوال میں سے کسی ایک قول پر بھی عمل کر کے محنت ولگن سے چالیس احادیث محفوظ کیا اور علم ومعرفت، رشد وہدایت کا پیکر بن کر یہ خدمت انجام دی، اسے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کیا ہوا وعدہ ملے گا''۔ (فیض القدیر شرح الجامع الصغیر،عبد الرؤف بن تاج مناوی رحمہ اللہ، ج۶ ص۱۱۸، رقم: ۱۲۳۳۵، ط: المکتبۃ التجاریۃ الکبری، مصر)

نیز فرماتے ہیں: ''اور جس نے تخریج واسناد کے ذریعہ امت اسلامیہ تک نہیں پہونچایا، اسے اس حدیث کا وعدہ شامل نہیں ہوگا اگرچہ اس نے انہیں چالیس احادیث کو زبانی یاد کرلیا ہو؛ کیوں کہ اس حدیث کی فضیلت کو پانے کا مدار امت کو نفع پہنچانے پر ہے اور وہ محض یاد کرنے کی صورت میں پایا ہی نہیں گیا، اور نص سے کسی ایسے معنی کا استخراج جو نص کو خاص کردے، جائز ہے، پھر اگر ان چالیس احادیث کو اسناد واجتہاد کے ذریعہ نقل کیا جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ اور ان کے مثل دوسرے حضرات نے کیا؛ تو وہ نقل کرنے میں اعلی درجہ پر فائز ہیں، اور اگر چالیس احادیث کو ان دواوین سے لیا جیسے کہ مصنف وغیرہ نقل کرتے ہیں؛ تو اس کا اس فضیلت میں داخل ہونا محل نظر ہے، کیوں کہ اس نے ان احادیث کو امت کے لیے محفوظ نہیں کیا، بلکہ صاحب کتاب نے کیا ہے، جس نے ان کی تخریج میں تگ ودو کی، اور اگر اس کا فضیلت میں داخل ہونا تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس کا داخل ہونا مسند ومجتہد کی طرح نہیں ہوگا، بلکہ اس کو صرف دیوان سے احادیث کو الگ کرنے کے سبب لوگوں تک آسانی سے پہنچانے کا اجر وثواب ملے گا، اسناد کا ثواب نہیں ملے گا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اگر حفظ تام نہیں پایا گیا تو اس فضیلت میں دخول تام بھی نہیں ہوگا''۔ (المرجع السابق، رقم: ۱۲۳۳۶)

مذکورہ بالا بیان سے مندرجہ ذیل چیزیں ثابت ہوئیں: (۱) چالیس احادیث کی فضیلت میں جو احادیث وارد ہیں، وہ سب شدید ضعیف یا موضوع نہیں، بلکہ بعض صرف ضعیف ہیں (۲) اس ضعیف حدیث یا متواتر پر عمل کر کے یا لاتعداد علما کے نقش قدم پر چل کر یا مطلق حدیث پہنچانے کے حکم کا اعتبار کرتے ہوئے چالیس احادیث محفوظ کر کے امت تک پہونچانا جائز ودرست ہے (۳) یہ فضیلت احادیث صحیحہ یا حسنہ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ اس شخص کو بھی حاصل ہوگی جس نے فضائل کے باب میں مقبول چالیس احادیث ضعیفہ کو محفوظ کر کے امت تک پہونچایا (۴) جس نے چالیس احادیث کے محفوظ کرنے میں یہ شرط لگائی ہے کہ وہ احادیث جرح وقدح سے خالی ہوں، قابل التفات نہیں، ہاں موضوع احادیث نہ ہونا مشروط ضرور ہے (۵) محض دواوین کتب سے نقل کر کے چالیس احادیث امت تک پہنچانے والا بھی اس شرف کا مستحق ہوگا اگرچہ اس کا شرف بطور تخریج واسناد پہنچانے والوں سے کچھ کم ہو (۶) چالیس احادیث کا جمع کرنا کسی باب کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ جس باب میں چاہیں جمع کرسکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کو زیادہ سے زیادہ نشر کرنے کی توفیق عطا کر کے اس کی فضیلت سے مالا مال فرمائے: آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ☆

حضور صدر الشریعہ کی تعلیم و تربیت کا نرالا انداز

از: حضرت مولانا محمد لطف اللہ قادری: دارالافتا شاہی جامع مسجد (متھرا: یوپی)

محسن اعظم استاذ گرامی حضرت علامہ مفتی امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ کے دینی وعلمی کارناموں پر تو پختہ کار علمائے ذوی الاحترام ہی قلم اٹھا سکتے ہیں۔ میں تو ان کے علم وفضل کے بارے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں ''حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ والرضوان کا مبلغ علم وفضل اللہ اکبر۔ اس بارے میں کچھ اور معروضات پیش کرنے سے پہلے حضرت موصوف کی شان میں وہ منقبت جو بمقام بریلی شریف بماہ صفر ۱۳۶۳ھ کہی تھی، پیش کر رہا ہوں۔

واہ آن امجدی واہ شان امجدی
بن گئے مخدوم ہوکر خادمان امجدی
تاابد پھولے پھلے یہ گلستان امجدی
اوردن دونا ہو یارب دودمان امجدی
شادماں ہوتے رہیں سب دوستان امجدی
غیظ میں جلتے رہیں سب دشمنان امجدی
حامل اسرار ربانی جنان امجدی
مطلع انوار ایمانی وہان امجدی
انکشاف عقد حقانی بیان امجدی
سنیوں کا دور سلطانی زمان امجدی
کس قدر خاموش ہے یا روز بان امجدی
خود کھنچے آتے ہیں دیکھو عاشقان امجدی
اٹھ گئی دنیا سے نسل نوجوان امجدی
صبر و شکر و حمد کرتی ہے زبان امجدی
ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں خادمان امجدی
مانگتے ہیں رب سے خیر مال وجان امجدی
کتنا مشکل دور دورِ امتحان امجدی
دل ہلا دے گی نہ پوچھو داستان امجدی
نجد یا جل جل کے بس خاک میں مل جائے گا
ہم تو ہنستے ہی رہیں گے تجھ کو رونا آئے گا
فتنہ گر حملہ نہ کر یہ وار خالی جائے گا
سوتے شیروں کو جگا کر دیکھ تو پچھتائے گا
سنیوں میں ہے ابھی باقی نشان امجدی
روک آتی ہے قضا بن کر سنان امجدی
آج کیسی گرم ہے بزم رضائے نامور
ہے سفر میں جس کے بہر روشنی ماہ صفر
بادۂ رضوی بلاتی ہے وہ ساقی کی نظر
ہے فضا پر آج اک پر کیف مستی جلوہ گر
وجد میں کیا جھومتے ہیں میکشان امجدی
لطف کیا نغمہ سرا ہے مدح خوان امجدی

حضرت موصوف کے آخری طلبہ میں مجھ جیسے ایک نابکار کا بھی شمار ہے جس نے ان کی آخری حیات کے لمحات کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی دور اندیش نظر نے آخری وقت میں من جملہ اور چند خوش نصیب ہستیوں کے مجھ ناچیز کو بھی اپنی غلامی کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ چنانچہ اکثر وبیشتر سفر کے مواقع پر اپنے ہمراہ لے جایا کرتے تھے۔ میری عمر اس وقت ۱۷ یا ۱۸ سال کی تھی۔ سفر کی حالت میں ان کے پانوں کی ڈبی میرے ہی پاس رہا کرتی تھی۔ جب بھی طلب فرماتے تھے، میں پان پیش کر دیا کرتا تھا۔ ان کو میرا بنایا ہوا پان بہت مرغوب تھا۔ پان میں تمبا کو بہت ہی خفیف ہوا کرتا

تھا۔ کبھی کبھی ان سے نگاہ بچا کر میں بھی ان کی ڈبی کا پان کھا لیا کرتا تھا ۔اسی وقت سے میں بھی پان کا عادی ہو گیا، لیکن ان پر یہ ظاہر ہونے نہ دیتا کہ میں بھی پان کھاتا ہوں۔ اپنے ہونٹوں پر پان کی سرخی کو صاف کر لیا کرتا تھا۔

ایک دن بحالت سفر اتفاقاً ان کے پان میں میرے ہاتھ سے معمول سے کچھ زیادہ تمباکو پڑ گیا۔ فرمایا کہ میرے پان میں اپنی طرح زیادہ تمباکو ڈال دیا۔ اتنا سننا تھا کہ میں شرم سے پانی پانی ہو گیا کہ آج حضرت نے میرے پوشیدہ جرم کا پردہ فاش کر دیا۔ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ میرا پان کھانا حضرت کے علم میں نہیں ہے ۔اس ندامت کا میرے ہوش وحواس پر اس قدر گہرا اثر پڑا کہ حضرت معمولاً روزانہ دلائل الخیرات شریف پڑھا کرتے تھے حتیٰ کہ سفر میں بھی ناغہ نہ فرماتے ۔ اس سفر میں دلائل الخیرات شریف سامان سفر میں سے میرے ہاتھ سے کہیں گم ہو گئی، اس کے احساس سے میرے ہوش وحواس اور بھی ماؤف ہو گئے ۔ بقول کسے

آئینہ ان کا ٹوٹ گیا میرے ہاتھ سے
اب کوئی منہ دکھانے کی صورت نہیں رہی

میں نے بکوشش داب وآداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے جب دلائل الخیرات کے گم ہونے کا حال خدمت عالی میں عرض کیا تو مجھے ہلکی سی ڈانٹ پلائی ۔ فرمایا ''ہوش میں نہیں رہتا''۔ بریلی شریف پہنچ کر صبح کو مجھ سے فرمایا ''تھوڑا سا گل لے آؤ''، میں حکم پاتے ہی چل دیا، پھر مجھے واپس بلایا اور پوچھا : کیا لاؤ گے؟ میں نے عرض کی، حضور : گل ۔فرمایا: پھول نہیں، تمباکو کا گل ۔ غالباً حضرت کو یہ خیال آیا کہ سیدھا طالب علم کہیں بازار سے پھول نہ لے آئے، حالانکہ میں جانتا تھا کہ دانت مانجھنے کے لیے گل طلب فرمایا ہے۔

ایک مرتبہ میں ریاست دادوں میں کچہری کی چھت سے نیچے اتر رہا تھا اور حضرت نیچے سے اوپر تشریف لا رہے تھے۔ زینہ کافی چوڑا تھا۔ میں ایک طرف سمٹ کر آہستہ آہستہ اترنے لگا، جب اس سیڑھی پر پہنچا جس پر حضرت نے قدم رکھا تھا تو میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ فرمایا: کچھ نہیں اور اوپر تشریف لے گئے، میں نیچے اتر آیا۔ طلبہ کو مارنے کی عادت نہیں تھی۔ ہاں ڈانٹ بہت سخت تھی جسے سن کر طلبہ حواس باختہ ہو جاتے تھے۔ چونکہ میں اس وقت بزرگوں کے داب وآداب سے قطعاً نابلد تھا۔ حضرت کا تھپڑ کھا کر ''بات سمجھ آ گئی، اس لیے بات کی نہیں''۔ یہ ایک تھپڑ میرے حق میں نہایت کارآمد و مفید ثابت ہوا۔ مجھے اس ایک تھپڑ نے داب وآداب کی بہت سی منزلیں طے کرادی۔ میرے دل میں اب تک یہی حسرت باقی ہے کہ کاش ایسے چند تھپڑ اور بھی کھائے ہوتے۔

میرے تایا میاں مرحوم منشی اللہ بخش صاحب کو حضرت سے بڑی محبت وعقیدت تھی۔ حضرت کو عرق النسا کی تکلیف رہا کرتی تھی ۔ میرے تایا میاں مرحوم نے ایک نسخہ تحریر کر کے حضرت کی خدمت میں پیش کیا جو مفید ثابت ہوا اور اس نسخے کے گم ہونے پر حضرت نے کئی بار وہ نسخہ تایا میاں مرحوم سے بذریعہ تحریر طلب فرمایا۔ جب حضرت نے ریاست دادوں کو خیر باد کہا تو میں اور میرے تایا میاں مرحوم علی گڑھ تک ہمراہ رہے اور میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں حضرت سے دریافت کیا کہ حضور ان غلاموں کے لیے کیا حکم ہے؟ فرمایا: اس وقت تو میں اپنے وطن گھوسی جا رہا ہوں۔ یہ لوگ بریلی شریف چلے جائیں۔ میں مفتی اعظم مصطفیٰ میاں کے نام ایک رقعہ تحریر کیے دیتا ہوں۔ وہاں ان کی اچھی تعلیم ہو جائے گی۔ چنانچہ ہم لوگوں کو اپنے طلبہ تحریر فرما کر دار العلوم مظہر اسلام مسجد بی بی صاحبہ میں داخل کرا دیا۔ اس وقت مولانا سردار احمد علیہ الرحمہ وہاں صدر المدرسین تھے جو حضرت ہی کے تلامذہ سے تھے۔

حضور مفتی اعظم نے حضرت صدر الشریعہ کا مکتوب گرامی پا کر ہم چار طلبہ (۱) میں (۲) مولانا مظہر ربانی (۳) مولانا محبوب خدا بخش افریقی اور (۴) مولانا منظر اٹاوی کی تعلیم کا معقول انتظام فرما دیا۔ سب ساتھیوں کو مختلف مساجد میں امامت کے لیے بھیج دیا، لیکن مجھے اپنی خدمت میں رکھا۔ دولت خانہ شریف سے مجھے کھانا ملتا تھا اور حضور کی قیام گاہ میں پڑھتا، کھاتا پیتا اور سوتا تھا۔ میرے

تایا میاں مرحوم حضور کی خدمت میں اکثر عریضہ بھیجا کرتے تھے کہ حضور ایک یا دو کتابیں اپنے غلام کو خود پڑھائیں۔ جب بھی حضرت کی خدمت میں ان کا خط پہنچتا تو مجھ سے فرماتے کہ تمہارے والد کا خط آیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ایک دو کتابیں آپ خود پڑھائیں اور کسی قدر خفگی کا اظہار فرما کر فرماتے تم دیکھتے ہو، مجھے کسی وقت فرصت ملتی ہے؟ میں تمہیں کس وقت پڑھاؤں، پھر بڑی شفقت سے فرماتے۔ اچھا میرے پاس بیٹھ کر پڑھا کرو، جہاں ضرورت ہو پوچھ لیا کرو۔

اگر اس صورت حال کو استادی و شاگردی کہا جا سکتا ہے تو بحمد اللہ تعالیٰ مجھے حضور مفتی اعظم علیہ الرحمہ کی شاگردی کا بھی شرف حاصل ہے، حالانکہ میرے علم میں خاندان رضویہ کا شاید کوئی فرد بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان کو حضور مفتی اعظم نے خود پڑھایا ہو۔

قریباً ایک سال کے بعد حضور صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کا گرامی نامہ موصول ہوا کہ میں کچی باغ بنارس کے دینی مدرسہ میں بحیثیت شیخ الجامعہ آ گیا ہوں۔ تم لوگ چاہو تو مفتی اعظم مصطفیٰ میاں صاحب کی اجازت حاصل کر کے بنارس آ جاؤ۔ مکتوب گرامی پاتے ہی ہم چاروں طلبہ نے مشورہ کر کے حضور مفتی اعظم علیہ الرحمہ سے اجازت حاصل کی اور بخیر و عافیت حضور صدر الشریعہ کی خدمت میں بنارس پہنچ گئے اور وہاں قریباً ایک سال حضور کے سایۂ کرم میں تحصیل علم و دین میں مصروف رہے۔ چونکہ حضور کی آنکھوں کا آپریشن ہو چکا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد بینائی بالکل ختم ہو گئی، اس لیے حضور کچی باغ کے مدرسہ کو خیر باد کہہ کر اپنے وطن گھوسی شریف تشریف لے آئے اور حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کو بنارس بلا کر ہم جملہ طلبہ کو ان کے سپرد فرمایا۔

حضور حافظ ملت نے ہم لوگوں کے ساتھ خصوصی توجہ فرمائی، اس کی جزا مالک بے نیاز اپنے فضل و کرم سے عطا فرمائے۔ بالخصوص میرے ساتھ جو ان کے ظاہر اور پوشیدہ احسانات رہے، ان کو میں تا حین حیات فراموش نہیں کر سکتا۔ قیام مبارکپور کے دوران، میں ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو گیا تھا جس کا علاج حضور حافظ ملت نے اپنے جیب خاص سے کرایا اور حکیم صاحب کو بلوا کر فرمایا: حکیم صاحب! ان کا علاج نہایت معقول ہونا چاہئے، قیمتی سے قیمتی دواؤں کا خرچ میں خود برداشت کروں گا۔ میری عیادت کے لیے چند طلبہ کو مقرر فرما دیا تھا، تا کہ مجھے کوئی پریشانی نہ ہو۔

حضور صدر الشریعہ علیہ الرحمہ نہایت سادگی سے زندگی بسر فرماتے تھے۔ سوتی موٹا مضبوط سفید رنگ کا لباس زیب تن فرماتے۔ آخری حیات میں اس سادگی میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اپنی نسلی اولاد اور عام طلبہ کے ساتھ یکساں برتاؤ ہوا کرتا تھا۔ ہم طلبہ حضرت کو ابا کہا کرتے تھے اور حضرت بھی طلبہ کو اولاد کی طرح سمجھتے۔ تعلیم و تربیت میں حضور کا رویہ بہت سخت تھا۔ نمازوں کی پابندی اور احکام شریعت کی پابندی پر بہت زور دیتے۔ غلط ماحول سے روکتے، بد کلامی اور گالی گلوچ سے طلبہ کو باز رکھتے۔ طلبہ کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ نہایت عادلانہ انداز سے فرماتے۔ ریاست دادوں میں حافظ قاری رضاء المصطفیٰ زید مجدہ نے کسی طالب علم سے جھگڑتے ہوئے گالی بک دی۔ اس طالب علم نے حضرت کی خدمت میں شکایت پیش کی۔ صاحبزادے کو اسی وقت بلوایا اور جواب طلب فرمایا۔ انہوں نے جواباً عرض کی کہ ابا میں نے گالی نہیں بکی۔ سختی سے فرمایا: ''پھر کیا دعا پڑھی تھی''۔

اس سادگی کے باوجود حضرت کی ہر ہر ادا سے عالمانہ وقار، سنجیدگی، کم سخنی نمودار ہوتی تھی۔ صرف وقت ضرورت ہی مختصر کلام فرماتے۔ آپ کی زندگی خیر الکلام ماقلّ ودلّ کی مصداق تھی۔ علم النفس کے ماہر تھے۔ طلبہ ان کی ڈانٹ سے زیادہ متاثر ہو جاتے تو کوئی ایسا خوش کن جملہ فرماتے جس سے غم غلط ہو جائے۔ سبق میں ناغہ یا بغیر مطالعہ کیے پڑھنا سخت ناگوار تھا۔ قیام بنارس کے دوران، میں کبھی کبھی میلاد شریف پڑھنے چلا جایا کرتا تھا، اس لیے مطالعہ چھوٹ جاتا تھا۔ سبق کے وقت چند سطریں پڑھنے پر سختی سے فرماتے: رات کو مطالعہ کیا تھا؟'' آنکھ تو اٹھتی نہیں، دیں کیا جواب'' سوا اس کے

چارہ نہیں کہ اشک ندامت آنکھوں سے جاری ہوجائیں، جب ملاحظہ فرماتے کہ غم سبق سمجھنے میں مخل ہوگا تو ایک دن مجھے خوب یاد ہے حسب موقع فرمایا: ''سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا'' میرا غم دور ہوا، اور چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اس لیے کہ ایسی بات حضرت کی زبان مبارک سے پہلی ہی بار سنی تھی اور میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ حضرت نے یہ جملہ میرا غم دور کرنے کے لیے بولا ہے۔

کسی بزرگ کی خدمت میں ہمہ وقت رہنے والے خدام کسی قدر بے تکلف و بے باک ہوجایا کرتے ہیں، لیکن حضور کا خداداد رعب وجلال میں نے ایسا دیکھا کہ کبھی بے تکلفی و بے باکی ہم طلبہ کے قریب تک نہ آئی۔ ہمہ وقت ساتھ رہنے کے باوجود ہم لوگ آپس میں اس قدر آہستہ بات کرتے کہ صرف باہم ہی ایک دوسرے کی بات سنتے اور کہتے تھے۔ یہ صفت رعب وجلال حضور مفتی اعظم اور حضور حافظ ملت کی خدمت میں رہ کر بھی مشاہدہ میں آئی۔

کچی باغ بنارس کے مدرسہ میں مطالعہ سے فارغ ہوکر ہم چاروں طالب علم حضرت کی خدمت میں حاضر ہوجاتے اور دست و پا دباتے اور نہایت ادب کے ساتھ حضور اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے زمانۂ مبارک کے حالات دریافت کرتے۔ حضور بڑے تاثر سے سرد آہ بھرتے اور فرماتے: ''آہ تیرا زمانہ'' اور ہم لوگوں سے ہم کلام ہوکر فرماتے: ان کے زمانے میں جن مسائل کی تحقیق ہوگئی، ہو گئی۔ اب کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس سے دل کو اطمینان حاصل ہو۔

گھوسی شریف میں مجھے کئی کئی دن رہنے کا بارہا موقع ملا۔ وہاں پہنچ کر میں ادھر ادھر گھومنے کے لیے نکل جاتا۔ حضرت ناشتے اور کھانے کے وقت میرا انتظار فرماتے۔ جب میں واپس آتا تو کسی قدر خفگی سے فرماتے: تم کہاں چلے جاتے ہو؟ میں دیر سے انتظار کر رہا ہوں، پھر اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلاتے۔

حضور کبھی کبھی مزاح بھی فرماتے۔ ایک مرتبہ ریاست دادوں میں حضرت مولانا امین الدین صاحب چھپراوی علیہ الرحمہ ایک طالب علم سے گھیاں کے پتوں کا تقاضہ فرما رہے تھے تو حضور نے سن کر ارشاد فرمایا: یہ پتے تو کیا آپ کو گھیاں بھی نہیں دے گا۔

حضور اپنے طلبہ کو بزدل بھی نہیں بناتے تھے۔ ایک مرتبہ ریاست دادوں میں جب میں مدرسہ سے باہر بستی میں کسی کام سے گیا تو وہاں کے چند جاہل لڑکوں نے جو مجھ سے میری اچھی صحت دیکھ کر جلا کرتے تھے، انہوں نے جب مجھ سے بدکلامی کی۔ میں نے بھی ان کو برا بھلا کہا۔ وہ سب مل کر مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مجھے خوب زد و کوب کیا۔ میں روتا ہوا حضور کی خدمت میں فریادی ہوا تو فرمایا: ''کدو کہیں کا، میرے پاس پٹ کر آیا ہے، مار کر آتا تو میں ان کو دیکھ لیتا''۔

جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے میں نے تحصیل علم سے فراغت پائی۔ میرے ہم سبق ساتھیوں میں مفتی عبدالمنان مبارکپوری، قاری محمد یحییٰ مبارکپوری علیہ الرحمہ اور مولانا عبدالرشید چھپراوی وغیرہم زیدمجدہم تھے۔ فراغت کے بعد میں مبارکپور سے اپنے آبائی وطن جلالی ضلع علی گڑھ آ گیا اور عرصۂ دراز تک میرا علاج جلالی اور علی گڑھ میں ہوتا رہا۔ اسی دوران میں نے عرس رضوی شریف میں حاضری دی۔ ڈاکٹر نے بریلی شریف جانے کی اجازت اس شرط پر دی کہ آپ انجکشن لگنے کی تاریخ تک علی گڑھ واپس آجائیں، ورنہ علاج میں فرق پڑ سکتا ہے۔ میں نے وعدہ کرلیا اور بریلی شریف کے لیے روانہ ہوگیا۔ حضور صدرالشریعہ بھی بریلی شریف تشریف لے آئے تھے اور مبارکپور سے میری سند فراغت بھی اپنے ہمراہ لیتے آئے اور بریلی شریف میں وقت کے اکابر علما سے میری سند پر دستخط کرا کر مجھے عطا فرمائی۔

اس وقت حضرت صدرالافاضل مولانا نعیم الدین صاحب مرادآبادی علیہ الرحمہ سخت علیل تھے، اس لیے عرس شریف میں حاضر نہ ہوسکے۔ عرس رضوی شریف سے فراغت کے بعد حضور صدر الشریعہ وحضور مفتیٔ اعظم علیہما الرحمہ حضرت صدرالافاضل کی عیادت کے لیے بریلی شریف سے مرادآباد شریف تشریف لے گئے اور مجھے بھی اپنی رکاب سعادت میں لے لیا۔ وہاں سے دوسرے دن صبح کو حضور مفتیٔ اعظم کو بریلی شریف واپس جانا تھا۔ اس وقت مرادآباد

کے بازار میں پاکستان جانے والوں کا گھریلو سرو سامان سستے داموں پر فروخت ہورہا تھا۔ میں نے بھی وہاں سے ایک وزنی پاندان اور ایک بڑا لوٹا خریدا اور اسی لوٹے میں پانی بھر کر حضور مفتی اعظم علیہ الرحمہ کو وضو کرایا۔ فضا خراب ہونے کی وجہ سے اس وقت مرادآباد اور اکثر مقامات پر قنوت نازلہ پڑھا جارہا تھا۔ حضور مفتی اعظم علیہ الرحمہ نے مجھے حکم فرمایا کہ مجھے بریلی پہنچاؤ۔ میں نے وعدہ کرلیا۔ اس کے بعد حضور صدر الشریعہ نے مجھے حکم فرمایا کہ مجھے گھوسی پہنچاؤ، میں نے ادباً بے تامل وعدہ کرلیا۔

دونوں کی سواری روانہ ہونے میں قریباً ڈیڑھ گھنٹے کا فاصلہ تھا۔ اب مجھے اپنی نادانی پر نہایت افسوس ہوا کہ میں نے یہ کیا حماقت کرلی کہ دونوں سے وعدہ کرلیا پھر ڈاکٹر سے علی گڑھ میں وقت پر انجکشن لگوانے کا بھی وعدہ تھا۔ اس صورت حال نے میرے دماغ کو ماؤف کردیا کہ ان تینوں وعدوں کا ایفا کس طرح ہوسکے گا اور وعدہ خلافی کی عادت نہیں تھی، نہ اب ہے۔ حسب وعدہ پہلے حضور صدر الشریعہ کے ساتھ ہولیا۔ اتفاقاً ایک صاحب حضور سے آکر ملے جو گھوسی یا وہاں کے قرب وجوار کے باشندہ تھے، انہوں نے حضور کو اپنے ہمراہ گھوسی شریف پہنچانے کا وعدہ کرلیا۔ حضور نے فرمایا: مولوی لطف اللہ! اب میں ان کے ساتھ بآرام چلا جاؤں گا، تمہیں میرے ساتھ چلنے کی اب ضرورت نہیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور حضور مفتی اعظم کو لے کر بس اسٹیشن پہنچا، یہاں تک کہ ہم دونوں بس میں سوار ہوگئے۔

اب مجھے بار بار یہ خیال پریشان کررہا تھا کہ علی گڑھ والے ڈاکٹر کو کیا جواب دوں گا۔ حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ نے میرا متفکر چہرہ دیکھا اور کسی قدر مسکراہٹ کے ساتھ ارشاد فرمایا: مولوی لطف اللہ! تم علی گڑھ جاؤ۔ میں نے ادباً عرض کی کہ نہیں حضور! میں آپ کو بریلی شریف پہنچا کر چلا جاؤں گا، لیکن حضور نے باصرار فرمایا: ہم خوشی سے کہہ رہے ہیں کہ تم علی گڑھ جاؤ، اس لیے کہ بس میں ایک صاحب بریلی کے باشندہ جو حضور کے معتقد بھی تھے، موجود تھے۔ انہوں نے حضور کی دست بوسی کی اور اپنے ہمراہ لے جانے کا وعدہ کرلیا۔ اب کیا تھا میری خوشی کی انتہا نہ رہی اور میں علی گڑھ کے لیے روانہ ہوگیا اور راستہ بھر ان دونوں مبارک ہستیوں کی کرامتوں کے سایہ میں سفر کرتا رہا جو تاہنوز میرے دل کی گہرائی میں گھر کیے ہوئے ہیں، انہیں کے سایہ میں علی گڑھ پہنچا اور وقت پر انجکشن لگوایا اور اب تک ان بزرگوں کے فیوض وبرکات سے اس طرح مالا مال ہوں کہ ان سے باوجود پردہ فرمانے کے مجھے کوئی دوری ہی محسوس نہیں ہوتی۔

ایک دن متھرا کی جامع مسجد میں غالباً عصر سے فارغ ہو کر دل میں حضور استاذی صدر الشریعہ کا خیال آگیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور بار بار یہ خیال آتا تھا کہ حضور نے یہ کیا کیا کہ اپنے ساتھ رکھ کر ہی فراغت نہ کرائی، مبارکپور بھیج دیا۔ بالآخر دل میں ایک جواب حضور کی جانب سے القا ہوا کہ بچوں کو آگے سبق اس وقت پڑھایا جاتا ہے، جب پڑھا ہوا سبق یاد ہوجائے۔ اب مجھے تسکین حاصل ہوئی اور سوچا کہ تجھے جتنا پڑھا دیا ہے، وہی کافی ہے۔ **عند ذکر الصالحین تنزل الرحمة**

حضور صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے آخری نوازش نامہ کا خلاصہ جو قیام آگرہ کے زمانہ میں غالباً ۱۹۴۸ء میں موصول ہوا۔

''عزیزی مولوی لطف اللہ وعلیکم السلام! دین کی خدمت میں حتی المقدور لگے رہو، لیکن تشدد کا زمانہ نہیں، سنجیدگی سے کام لینا چاہئے''۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی سیدنا ومولانا محمد وعلٰی الہ وصحبہ وعلماء امتہ وبارک وسلم دائماً ابدا

☆☆☆☆

مسلمانوں کے مسائل کا حل: تعلیم، تعلیم، تعلیم

حافظ محمد ہاشم قادری مصباحی (جمشید پور)

اللہ رب العزت نے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو انسانوں کے رشد وہدایت کے لیے مبعوث فرمایا۔ ظاہری بات ہے کہ رہبری کرنے والا علم کی دولت سے مالا مال ہوگا، تبھی وہ رہبری کرے گا اور ہدایت کا راستہ بتائے گا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک سبھی پیغمبروں کو اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت سے نوازا۔

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے اپنا خلیفہ بنایا اور ہر طرح کا علم عطا فرمایا۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ فَقَالَ اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ ھٰٓؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (سورہ بقرہ: آیت ۳۱) ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام (اشیا کے) نام سکھائے، پھر سب (اشیا) کو ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا: سچے ہو ان کے نام بتاؤ (کنزالایمان) علم عطا کرنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے سجدہ کروایا۔

قرآن کریم میں دیگر انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علم کا ذکر موجود ہے۔ نبی آخر الزماں سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جب اپنا کلام قرآن مجید نازل فرمایا تو اس کی ابتدا بھی اقــــرأ (پڑھیے) سے فرمایا، یعنی اپنے رب کا نام لے کر پڑھیے، یا بالفاظ دیگر بسم اللہ کہیے اور پڑھیے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس وحی کے آنے سے پہلے صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا رب جانتے اور مانتے تھے، اسی لیے یہ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ آپ کا رب کون ہے؟ بلکہ یہ کہا گیا کہ اپنے رب کا نام لے کر پڑھیں:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ، الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (سورہ علق: آیت ۱ تا ۵) ترجمہ: پڑھو اپنے رب کے نام سے، جس نے پیدا کیا، آدمی کو خون کی پھٹک سے بنایا، پڑھو اور تمہارا رب ہی سب سے بڑا کریم جس نے قلم سے لکھنا سکھایا، آدمی کو سکھایا جو نہ جانتا تھا۔ (کنزالایمان)

یہی وہ پہلا پیغام ہے جو اللہ رب العزت نے اپنے حبیب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو انعام فرمایا۔ یہی وہ پہلی رحمت ہے جو ارحم الراحمین نے اپنے محبوب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو عطا فرمایا۔ اور یہی وہ نعمت اعلیٰ ہے جس کی زیادتی کے لیے اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حکم بھی فرمایا: وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (سورہ طٰہٰ: آیت ۱۱۴) ترجمہ: اور تم عرض کرو کہ اے رب مجھے زیادہ علم دے۔ (کنزالایمان)

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ سے علم کی فضیلت واضح طور پر ثابت ہوتی ہے، اس لیے کی خدائے تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو علم کے علاوہ کسی دوسری چیز کی زیادتی کے طلب کا حکم نہیں دیا (فتح الباری شرح بخاری، ج اول، ص ۱۳۰) کلام الٰہی میں ۱۴۳ سے زیادہ آیتوں میں علم کی فضیلت واہمیت کا ذکر موجود ہے

(القرآن رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اور اللہ تعالیٰ وسعت والا اور علم والا ہے، اللہ حکمت ودانائی دیتا ہے جسے چاہے اور جسے حکمت (یعنی علم ملا) اسے بہت بھلائی ملی۔ (کنزالایمان) (سورہ بقرہ: آیت ۲۶۸ تا ۲۶۹)

فضائل علم سے متعلق چند احادیث کریمہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں: حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلْعِلْمُ حَیَاۃُ الْاِ سْلَا مِ وَ عِمَا دُ الدِّیْن ترجمہ:علم اسلام کی زندگی اور دین کا کھمبا ہے۔(کنز العمال ج اول،ص۷۶- علامہ علاء الدین متقی برہان پوری علیہ الرحمہ(م ۹۷۵ھ)

(۲)عَلَیْکُمْ بِالْعِلْمِ فَاِنَّ الْعِلْمَ خَلِیْلُ الْمُؤ مِن (کنز العمال ج اول،ص۸،راوی حضرت عباس وحضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہما)

ترجمہ:علم کولازم پکڑلو،اس لیےعلم مومن کا گہرادوست ہے۔

حضوراقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشادفرماتے ہیں:مَنْ صَارَ بِالْعِلْمِ حَیًّا لَمْ یَمُتْ اَبَدًا۔ ترجمہ:جوعلم سے زندہ ہوگا وہ کبھی نہیں مرے گا(حاشیہ ہدایہ ج اول،ص۲)

علم کی اہمیت وضرورت سے کون انکارکرسکتا ہے،مگر افسوس صد افسوس! آج نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں مسلمان تعلیمی میدان میں پیچھے ہیں۔ایک اخباری رپورٹ کے مطابق علمی میدان میں سب سے پچھڑا ملک افغانستان ہے،جس کا دوسرا نمبر ہےاور حیرت کی بات یہ ہے کہ قدرتی وسائل تیل سے مالا مال اسلامی ممالک کا گراف بھی بہت نیچے ہے جو انتہائی شرمناک بات ہے۔ہندوستان میں تو مختلف سروے میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی انتہائی افسوس ناک ہےاور سچر کمیٹی کی رپورٹ نےتو سب کو ہلا ڈالالیکن ابھی بھی جوخواب غفلت،سستی،کاہلی اور بے حسی میں جی رہا ہے تو وہ مسلمان ہی ہے، جبکہ ہندوستانی آئین CONSTITUTION کے آرٹیکل 301: میں کہا گیا ہے کہ ہراقلیت چاہے وہ مذہبی یالسانی ہو،اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق تعلیمی ادارے قائم کرے اور چلائے۔

مذہبی جلسوں،کانفرنسوں،جلوسوں وعرسوں میں جو جوش و خروش پایا جاتا ہے،وہ عام اجتماعی ملی مسائل خاص کر تعلیمی مسائل میں کیوں نہیں ہوتا،مسلمانوں کو چاہیے کہ تعلیم کو پہلی ترجیح دیں، اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور اپنی ضرورتوں کے مطابق تعلیمی ادارے قائم کریں۔تعلیم ہی بے یارومددگار مسلم قوم کے لیے نسخہ کیمیا ہے ۔

وقت کی قدر کیجیے۔تعلیم حاصل کریں۔تعلیم ہی غربت کا علاج ہے اور اس کی ذمہ داری قائدین ملت، دانشوران امت، علمائے دین اور اہل ثروت لوگوں پر ہے۔موجودہ ہندستانی ماحول میں مسلمانوں کو اپنی ذمہ داری نہایت ایمانداری ودل جمعی سے خود نبھانا ہوگا۔اگراب بھی نہ جاگےتو پھرآگے کا حشر اورخراب ہوگا۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندی مسلمانو!
تمہا ری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستا نوں میں
مرشد کی تعلیم یہ تھی اے مسلم شو ریدہ سر
لا زم ہے رہرو کے لیے دنیا میں سا مان سفر
بدلی زمانے کی ہوا،ایسا تغیرآ گیا
تھے جو گراں قیمت کبھی،اب ہیں متاع کس مخر
اس دورمیں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا
ہے خون فا سد کے لیے تعلیم مثل نیشتر
رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودامجھے
وا جب ہے صحرا گرد پر تعمیل فر مان خضر

اسلام دشمنوں کی دشمنی اورحکومت کی بے توجہی کا شکوہ کر کے مسلمانوں کی بدحالی کا علاج نہیں کر سکتے۔خودکوعملی زندگی میں لانا پڑے گا۔اللہ رب العزت نے ارشادفرمایا:اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُمَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْامَا بِاَ نْفُسِہِمْ ۔ ترجمہ:بے شک اللہ کسی قوم کی حالت کونہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔

(کنزالایمان)

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ تعلیم پر پوری توجہ دیں۔قیمتی کمائی کا پورا حصہ خوبصورت مکانوں کی تعمیر،سالگرہ،BIRTHDAY اورطرح طرح کی پارٹیوں میں خرچ نہ کریں۔شادیوں میں فضول خرچی کر کے جھوٹی شان دکھلانے سے سماج میں عزت نہیں بنتی۔ عزت وذلت اللہ کی قدرت میں ہے۔اللہ تعالیٰ جسے چاہےعزت عطافرمائے،جسے چاہے،ذلت کےعمیق گڈھے میں ڈالدے۔

تعلیم کو پہلی ترجیح دیں۔بچوں کو وقت دیں۔پیار سے ان پر مسلط رہیں۔کفایت شعاری اپنائیں۔اپنے بچوں اوراپنی قوم کے بچوں کی تعلیم پر گاڑھی کمائی خرچ کریں۔تعلیم کے ذمہ داران اور اسکول،کالج ویونیورسٹی کےاساتذہ سے بچوں کی تعلیم پر تبادلہ خیال

کرتے رہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔ آپ کے بچے کا مستقبل تابناک ہوگا۔ سماج آپ کو یاد رکھے گا۔

اسے مل گئی جاوداں زندگی
جو سعی مسلسل کا پابند ہے

تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کے اخلاق و کردار پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بچہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے صرف کمائی کرنے والی مشین بن جائے اور اخلاقیات سے نابلد ہو۔ یہ والدین، سماج اور ملک کے لیے زہر ہلاہل ہوگا۔ آج بڑے بڑے گھوٹالوں کے سردار یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی لوگ ہیں جو غریبوں کی محنت کی کمائی اور ملک کے خزانے کو نت نئے طریقوں سے لوٹ رہے ہیں اور قانون کو ٹھینگا دکھا رہے ہیں۔

وہ قانون کی پکڑ سے کوسوں دور آرام و تعیش کی زندگی گزار رہے ہیں۔ سیکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ آج سماج کا عزت دار طبقہ ڈاکٹر مانا جاتا ہے۔ چند کو چھوڑ کر دیکھئے کہ کیسے غریب مریضوں کو ذبح کر رہے ہیں۔ تعلیم کا مقصد یہ نہ ہو کہ صرف اور صرف زیادہ سے زیادہ کمائی کر کے اپنی زندگی بہتر سے بہتر گزاری جائے۔ تعلیم کے بہت سے مقاصد ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ اپنی اور اپنی قوم اور سماج کی غربت کا علاج بھی کریں۔

جو ادارے، تعلیمی میدان میں سرگرم عمل ہیں، ان کی ہر ممکن مدد کی جائے۔ خاص کر مالدار لوگ اس طرف توجہ دیں تاکہ یہ ادارے مسلم معاشرے اور ملک سے ناخواندگی (جہالت) دور کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔ تعلیم کے ساتھ کیریکٹر کی طرف بھی توجہ دی جائے۔ عصری تعلیم گاہوں میں اخلاقی و دینی تعلیم کے مضامین داخل کیے جائیں۔ ناظرۂ قرآن کی تعلیم اور دین کی بنیادی تعلیمات سے آگاہی کرائی جائے، جو ہر مسلمان کے لیے فرض کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں کوتاہی آخرت میں پکڑ کی موجب ہوگی۔ اس کے لیے مناسب عملی تدابیر اختیار کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

ہر زمانے میں تعلیم کی اہمیت رہی ہے اور آج تو یہ قوموں کے عروج و زوال کا سبب ہے۔ دینی مدارس میں بھی انگریزی، کمپیوٹر، سائنسی علوم اور ٹکنالوجی کو شامل کیے جائیں۔ علما و حفاظ کو ان علوم کی جانکاری دی جائے، جس سے اسلام اور مسلمانوں کی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہو۔ تعلیم کی طاقت POWER OF EDUCATION ہی اصل طاقت ہے۔ آنکھیں کھولیں، دیکھیں اربوں کھربوں ڈالر کے مالک اسلامی ممالک کا کیا حال ہے۔ آج تک کوئی ایک چیز بھی ایجاد نہ کر سکے۔ تعیش کی زندگی کے سوا کچھ نہیں۔ عراق، لیبیا، شام، افغانستان وغیرہ کا کیا حال ہے، بتانے کی ضرورت نہیں۔ جن کے پاس تعلیم کی طاقت ہے، وہ حکمرانی کر رہے ہیں جیسے امریکہ، جرمنی، جاپان وغیرہ۔

ہندوستان میں بھی صرف ڈھائی فیصد برہمنوں کا ہر جگہ قبضہ ہے۔ مسلمانوں کی نمائندگی نہ کے برابر ہے۔ مسلمانوں کو ہمت ہارنے، مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، ضرورت ہے تو بس لوگوں میں نئی روح پھونکنے کی، بیدار کرنے AWARENESS اور خود بھی بیدار رہنے کی۔

الحمد للہ! پہلے کی بہ نسبت اب مسلمانوں میں تعلیم کی جانب توجہ ہوئی ہے۔ ضرورت ہے اس طرف مزید توجہ دی جائے، تاکہ مسلمانوں کی زبوں حالی، مفلسی، خستہ حالی دور ہو سکے۔ اس کے علاوہ دوسرے جو راستے ہیں، کمزور ہیں۔ تعلیم ہی حاصل کر کے کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مسلمانوں کو یہ نعرہ دینے کی ضرورت ہے۔ علم حاصل کر کے دنیا کے وسائل پر قابض ہو جاؤ۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث پاک ہے: قَلِيلُ الْعَمَلِ يَنْفَعُ مَعَ الْعِلْمِ وَكَثِيرُ الْعَمَلِ لَا يَنْفَعُ مَعَ الْجهْلِ۔ ترجمہ: تھوڑا عمل علم کے ساتھ فائدہ دیتا ہے اور زیادہ عمل جہالت کے ساتھ فائدہ نہیں دیتا ہے۔ (کنز العمال، ج اول، ص ۸۸- راوی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ) داغ دہلوی کے اس شعر پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

رہتا ہے نام علم سے زندہ ہمیشہ داغ
اولاد سے تو بس یہی دو پشت چار پشت

اللہ رب العزت تمام مسلمانوں کو علم کی اہمیت سمجھنے اور اس پر توجہ دینے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے: آمین ثم آمین

یہود ونصاریٰ اور مسلمان　　قسط اول

دنیا بھر میں مسلمانوں کے قتل عام کی دلخراش داستان

مولانا شاداب امجدی گھوسوی: استاذ دارالعلوم فیضان غوث اعظم (سورت)

اسلام روز اول ہی سے ظلم وستم کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔ فاران کی چوٹی سے جب پہلی بار خاکدان گیتی پر صدائے توحید ورسالت گونجی تو وہی لوگ جو پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صادق وامین مانتے تھے، ظلم وبربریت کے پہاڑ توڑنے لگے۔ رحیم وکریم پیغمبر کا عرصہ حیات تنگ کر کے رکھ دیا۔ اس کے بعد جو نفوس قدسیہ داخل اسلام ہوئے، وہ بھی ان کفار ومشرکین کے ظلم وستم کا نشانہ بنے۔ کبھی راستوں میں کانٹے بچھائے گئے، تو کبھی گلیوں سے گزرتے ہوئے کوڑا پھینکا گیا، کبھی عین حالتِ نماز میں جسم اقدس پر غلاظتیں رکھ دی گئیں تو کبھی طائف کی گلیوں میں پتھراؤ کر کے لہو لہان کیا گیا، کسی کو گرم ریتوں پر گھسیٹا گیا، غرضیکہ پیغمبر اسلام اور ان کے متبعین پر ظلم وستم کا ہر طریقہ اپنایا گیا۔

مسلمانوں پر مظالم کی یہ داستان یہیں ختم نہیں ہوتی، بلکہ اسلام جوں جوں اکنافِ عالم میں پھیلتا گیا، اس پر ظلم کی تاریخ بھی دراز ہوتی گئی۔ دسویں صدی عیسوی تک اسلام دنیا کے بیش تر ممالک میں پھیل چکا تھا۔ تاریخ کے اوراق گواہی دیتے ہیں کہ گیارہویں صدی سے منظّم طریقے پر پوری دنیا میں مسلمانوں کے قتل عام کا سلسلہ شروع ہوا۔ چیچینیا میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، ایک لاکھ 20: ہزار چیچن مسلمانوں کو شہید کیا گیا، دس لاکھ بے گھر کئے گئے۔ کوسوو میں سات ہزار مرد، عورتوں اور بچوں کا قتل عام ہوا، ۱۰۰ اجتماعی قبروں میں 10: ہزار فرد کو دفن کیا گیا۔ دوسری طرف ہزاروں عورتوں کی عصمتوں کو بھی تا تار کیا گیا۔ نائجیریا میں عیسائیوں کے ہاتھوں ہزارہا ہزار مسلمانوں کے قتل عام کی ایسی دلخراش داستان کو پڑھ کر آنکھیں خون کے آنسو روئیں۔ بوسنیا میں 20: ہزار مسلمانوں کا عیسائیوں نے قتل عام کر کے چرچ میں موسیقی وشراب نوشی کا پروگرام رکھا اور جشن آزادی منائی۔ وہیں 75: ہزار سے زائد مسلمان لڑکیوں کی آبروریزی کی گئی۔

الجزائر میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد الجزائری صدر نے اعتراف کیا کہ ایک لاکھ افراد قتل ہوئے۔ صرف ۲۰۰۰ء میں 9123: افراد قتل ہوئے۔ برما میں ایک لاکھ مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں، کو قتل کیا گیا۔ چالیس علما کو زندہ دفن کر دیا گیا۔ بلغاریہ میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا اور انہیں اپنے 600: سالہ پرانے وطن کو خیرآباد کہنا پڑا۔ یوگوسلاویہ میں تقریباً 1 3: ہزار مسلمانوں کو شہید کیا گیا، انڈونیشیا میں تقریباً 27: ہزار مسلمان شہید کئے گئے۔ فلپائن میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد وہاں کے صدر کا بیان آیا کہ 3: لاکھ 38: ہزار فلپائنی مسلمان قتل کئے جا چکے۔

البانیہ میں ایک لاکھ سے زائد مسلمانوں کا قتل ہوا، تقریباً 15: سو البانوی مسلمانوں کی لاشوں کو جلایا گیا۔ ایسے ہی عراق، صومالیہ، بھارت، چین، کمبوڈیا، افغانستان، فلسطین، شام، حلب کی سرزمین بھی مسلمانوں کے قتل عام سے رنگین ہیں۔

ظلم وبربریت کی یہ ایک مجمل فہرست ہے۔ ان میں سے ہر ایک واقعہ کو بالتفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں اور ان مظالم کی کیفیت کو حیطۂ تحریر میں لانے کی قلم میں تاب وطاقت نہیں، مگر پھر بھی خون مسلم کو تھوڑی سی حرارت دینے اور ان کے اندر کچھ بیداری لانے کے لیے چند ممالک میں مسلمانوں پر کئے گئے

جبر واستبداد کی داستان کو تحریر کرنا بھی ضروری ہے۔

آج پوری دنیا کے کافر اسلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ دنیا بھر میں کم سے کم 50: لاکھ مسلمانوں کو شہید کیا جا چکا ہے۔ کہیں ہتھوڑوں سے سر پھوڑے گئے، کہیں تندور میں زندہ جلایا گیا، کہیں مسلمانوں کے قتل کے لیے کافر آپس میں لڑ پڑتے کہ اس کو میں قتل کروں گا۔ بوسنیا میں 20: ہزار مسلمانوں کے قتل پر عیسائیوں کا چرچ میں موسیقی وشراب نوشی کا بڑا پروگرام ہوا، کہیں معصوم بچوں کو کہا گیا کہ اپنی مردہ ماں سے بدفعلی کرو، کہیں ماں باپ کے سامنے بچوں کو ذبح کیا گیا، پھر ان کے جسم کی بوٹیوں کو پکا کر ان کے ماں باپ کو کھلایا گیا۔

آج دنیا بھر میں ایک لاکھ سے زائد مسلمان عورتوں کی عزتیں لوٹی گئیں، ہزاروں مسجدوں کو شہید کیا گیا، مسلمانوں کی سیکڑوں اجتماعی قبریں دریافت ہوئیں۔ مسلمانوں پر جیلوں میں سائنسی تجربات کئے گئے، علما کو زندہ جلا یا گیا، ہزاروں مردوں، عورتوں کے نازک اعضا کاٹے گئے۔ دنیا بھر میں مسلمانوں پر ایسے مظالم ہوئے کہ زمین بھی رویا اور آسمان بھی رویا۔ ہم مسلمان کب جاگیں گے، کب تک خاموش رہیں گے۔ اگر اب بھی کفر کے خلاف اور عالم اسلام کے تحفظ کی خاطر منظّم اقدامات نہ کئے گئے تو دنیا میں ہمارا نام ونشان بھی نہیں ملے گا۔

غالبًا سولہویں صدی میں روسیوں کی چیچنیا میں آمد ہوئی۔ روسی شروع ہی سے توسیع پسندانہ عزائم کے حامل رہے ہیں۔ ان کی توسیع پسندی کی تاریخ بہت طویل ہے۔ ماضی میں روس اپنے آپ کو عیسائیت کا علمبردار اور محافظ کی حیثیت سے مسلم علاقوں کو ہڑپ کرتا رہا۔ اشترا کی انقلاب کے مکمل استحکام اور پورے وسطی اشیا اور قفقاز کے علاقے پر قبضہ کے بعد افغانستان دور جدید میں روسی اشترا کی استعمار کا نشانہ بنا اور اب چیچنیا اس کی جارحیت کا شکار ہوا ہے۔ روسیوں کے لیے چیچنیا میں مداخلت اور بعد ازاں اسے تاراج کرنا کوئی آسان مرحلہ نہ تھا۔

جب روسی فوج پہلی بار یہاں پہنچی تو انہوں نے اس علاقے کو چیچنیا کا نام دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کے باشندے اپنے دیس کو شیشیان سے موسوم کرتے تھے۔ گروزنی جو کہ چیچنیا کا دار الحکومت ہے، یہ لفظ بھی روسی زبان کا ہے اور اس کا معنی ہولناک اور ہیبت ناک ہے اور اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ روسیوں کو نہایت ہولناک نتائج کے بعد یہ علاقہ ہاتھ لگا۔ شیشانیوں کو زیر نگیں لانے کے لیے ۱۸۱۷ء سے ۱۸۶۴ء کے درمیان 40: سال تک روسیوں کو بر سر پیکار رہنا پڑا۔ بہر حال امام شامل جو مسلمانوں کے تحریک کے قائد تھے، اور ان کے مٹھی بھر ساتھی ۱۸۴۹ء میں گرفتار ہوئے، اس کے بعد سے یہ پورا خطہ روس کے زیر نگیں آ گیا۔

اس خطہ کے زیر نگیں آنے کے بعد ابھی چیچنیا کا اکثر حصہ روسیوں سے آزاد تھا۔ چیچنیا کو زیر نگیں لانے میں روسیوں کو بہت مزاحمت جھیلنی پڑی اور جب کثیر تعداد میں روسی فوجی ہلاک ہونے لگے تو بالآخر چیچین مجاہدین اور روسی فوج کے درمیان امن سمجھوتہ طے پایا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ چیچنیا 31: دسمبر ۲۰۰۱ء تک نہ آزاد ریاست ہوگا، نہ روس کا حصہ۔

اس امن سمجھوتہ کے بعد بھی روسیوں نے اپنا تشدد برقرار رکھا۔ ایک برطانوی اخبار ''دی آبزرور،، نے لکھا تھا کہ روسی فوج نے تربوت نامی گاؤں میں بڑے پیمانہ پر عام شہریوں پر اذیت ناک تشدد کر کے شہید کیا۔ حملے میں گاؤں کا مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔ اخبار کے مطابق دوسری جنگ اعظیم کے بعد عام شہریوں کا پہلی بار اتنے بڑے پیمانہ پر قتل عام کیا گیا ہے۔

جارجیا کی سرحد پر گاؤں کومولسکوئی پر 90: فضائی حملے کر کے سارے گاؤں کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا، کتنے چیچن مسلمان شہید ہوئے اس بارے میں کچھ اندازہ نہیں۔ چیچنیا میں روسی فوج نے ٹینک اور ہیلی کاپٹروں سے بمباری کر کے درجنوں شہروں، قصبوں اور آبادی کو کھنڈر بنا دیا۔ جس طرح بچھو ڈنک مارنے سے باز نہیں آتا، ویسے ہی روس کی وحشی اور ظالم قیادت بھی ظلم کرنے کی عادت

ترک نہیں کرسکتی۔بعض لوگوں کا خیال تھا کہ افغانستان میں روسی فوج کو جو عبرت ناک ہزیمت اٹھانی پڑی ہے،اس کے بعد روس کسی دوسرے ملک کے خلاف سوچ سمجھ کر طاقت کا استعمال کرے گا،مگر ایسا نہیں ہوا۔چیچنیا جیسے چھوٹے ملک پر جس طرح اس نے فوجی جارحیت کی ہے ،ایسا صرف ظالمانہ اور مجرمانہ ذہن رکھنے والے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔چیچنیا کی شہری آبادی پر گولوں اور بموں کی بارش کی گئی۔افغانستان کے بعد روس نے چیچنیا میں ظلم اور وحشت کی تاریخ کا ایک اور ہولناک باب رقم کر دیا۔

ماسکو سے جناب اسرار احمد کی ایک رپورٹ کینیڈا سے شائع ہونے والے جریدے ''کریسنٹ انٹرنیشنل''میں شائع ہوئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک چیچن لڑکی ازمان انسارودا اپنی یادداشتوں کو اکٹھا کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ وہ اپنے گاؤں کے 60: دیگر افراد کے ساتھ ایک گودام میں چھپی ہوئی تھی۔جب روسیوں نے ہمارا کھوج لگا لیا تو انہوں نے اس بات کی کوئی پرواہ نہ کی کہ یہاں صرف عورتیں بچے ہیں۔انہوں نے گودام میں دو گرینیڈ پھینکے اور گودام کا دروازہ بند کر دیا۔اس سے کافی تعداد میں خواتین اور بچے شہید ہو گئے۔اس کے بعد کچھ نے مل کر دروازہ کھولا اور ہم باہر کو بھاگے۔ بھاگنے والوں کی تعداد آٹھ تھی۔سپاہی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں واپس گودام میں ڈھکیل دیا۔

''آئیں دیکھیں کہ ابھی تک یہاں کتنے زندہ ہیں''۔ایک فوجی نے چیخ کر کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے مزید دو گرینیڈ پھینک دیئے۔ہر طرف آگ لگ گئی اور ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ میرے جسم کو بھی آگ لگی ہوئی ہے۔میں نے دیکھا کہ روسی فوجیوں نے پانی پر بھی قبضہ کیا ہوا ہے اور وہ پانی کو گلی کی دوسری جانب پھینک رہے ہیں۔وہ سارے قہقہہ لگا رہے تھے۔وہ سکون کے ساتھ شراب نوشی میں مست تھے اور میں اپنی خاندان سمیت جل رہی تھی۔

ظلم و بربریت کی ایسی کئی ایک داستانیں چیچنیا کی سرزمین پر رونما ہوئیں۔اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے چیچن مسلمانوں کو تشدد کر کے شہید کر دیا گیا اور کتنے ابھی تشدد کی چکّی میں پس رہے ہیں۔المختصر چیچنیا کا ہر قصبہ اور گاؤں مقتل بنا ہوا تھا۔(جاری)

فلسطین کیسے بنا اسرائیل؟

مولانا شفق قادری فیضی (کلکتہ)

تقریبا1300: قبل مسیح میں بنی اسرائیل فلسطین کے علاقہ میں داخل ہوئے اور دوصدیوں کے مسلسل کشمکش کے بعد بالآخر اس پر قابض ہوگئے۔ بنی اسرائیل نے اس علاقے کی رہنے والی قوم کا قتل عام کر کے اس سرزمین پر اسی طرح قبضہ کیا تھا جس طرح فرنگیوں نے ریڈانڈ نیز (redindians) کو ختم کر کے امریکہ پر قبضہ کیا۔ان کا دعوٰی تھا کہ خدا نے یہ ملک میراث میں ان کو دے دیا ہے،اس لیے ان کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے اصل باشندوں کو بے دخل کر کے، بلکہ ان کی نسل کو مٹا کر اس پر قابض ہوجائیں۔آٹھویں صدی قبل مسیح میں آشوریوں نے شمالی فلسطین پر قبضہ کیا اور وہاں دوسری اقوام کو لا بسایا۔چھٹی صدی قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے جنوبی ریاست پر قبضہ کر کے تمام یہودیوں کو ہلاک کر دیا، بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح پیوند خاک کر دیا کہ اس کی دیوار بھی اپنی جگہ پر قائم نہ رہی۔

ایک طویل مدت کی جلا وطنی کے بعد ایرانیوں کے دور حکومت میں یہودیوں کو پھر سے جنوبی فلسطین میں آکر آباد ہونے کا موقع ملا اور انہوں نے بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کی لیکن یہ دوسرا وقفہ بھی تین چار سو برس سے دراز نہ ہوا۔اور 70: قبل مسیح میں یہودیوں نے رومی سلطنت کے خلاف بغاوت کر دی جس کی پاداش میں شہر اور ہیکل دوبارہ مسمار کر دیا گیا۔

200: سال سے یہودی یہ دعا مانگتے رہے کہ اے خداوند' بیت المقدس پھر ہمارے ہاتھ آئے، تاکہ ہم ہیکل سلیمانی کو پھر سے تعمیر کریں۔ مذہبی تقریبات کے موقع پر یہودی اپنے گھروں میں اپنی تاریخ کا پورا ڈرامہ دہراتے ہیں گویا بیس صدیوں سے بچے بچے کے دل میں یہ بات بٹھائی جارہی ہے: "فلسطین تمہارا ہے، تمہیں واپس لینا ہے اور تمہارا مقصد زندگی یہ ہے کہ تم بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کو پھر سے تعمیر کرو" گویا بیس صدیوں سے یہودی قوم کی زندگی کا نصب العین یہی رہا ہے کہ وہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کریں۔

یہودی جہاں بھی رہے، ہمیشہ ان کے دو طبقات ہوتے تھے۔ایک عام مزدور طبقہ اور دوسرا وہ جو اپنی صلاحیتوں اور ذہانت کی وجہ سے مارکیٹ پر غلبہ واقتدار حاصل کر لیتے تھے۔ اقتصادی امور میں ان کی گرفت بہت مضبوط ہوتی تھی۔ہٹلر کے زمانے میں جرمنی کی دولت کے تمام ذرائع، تجارت،بینکوں،اخبارات اور ریڈیو پر یہودیوں کا ہی تسلط تھا۔ہٹلر نے ان کو ختم کرنے کی کوشش کی،لیکن وہ ناکام رہا۔

اکثر یہودی روس کے خلاف بغاوتوں کے مرتکب ہوتے تھے جس کی وجہ سے ان کے خلاف تادیبی کاروائیاں ہوتی تھیں۔ 1882 میں ان کا قتل عام ہوا،جس کے نتیجے میں لاتعداد یہودی مارے گئے۔اس قتل عام سے ان کی اس تحریک کا آغاز ہوا جو بعد میں تحریک صہونیت کہلائی۔

احمد شبلی نے لکھا:''اس شدید قتل کے بعد یہودیوں نے یہ اندازہ لگالیا کہ ان کے لیے ان کے آبا کی سرزمین ''ارض موعود'' کے علاوہ اور کہیں امن وچین نہیں۔اس تحریک کا بانی لیوپنسکر تھا۔اس نے ایک جماعت تشکیل دی جس کا نام جمعیت عشاق صیہون تھا''۔

(مقارنۃ الادیان از احمد شبلی جلد 1 صفحہ 97)

انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اتھیکس کے مقالہ نگار نے لکھا: صہونیت (zionism) ایک جدید یہودی قومی تحریک کا نام ہے جس کا پروگرام باقاعدہ طور پر سوئٹزرلینڈ کے شہر بال (ball) میں

ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ 29 سے 31 اگست 1897 میں طے کیا گیا۔

قیام تحریک کے مقاصد

تحریک صہونیت کا مقصد یہ تھا کہ یہودیوں کے لیے ایک عام تسلیم شدہ قانونی طور پر تحفظ والا وطن فلسطین میں مہیا کیا جائے۔ کانفرنس میں جو قرارداد پاس ہوئی، اس کی شقیں درج ذیل تھیں۔

(1) یہودی زراعت پیشہ افراد، صنعت کاروں اور تاجروں کو فلسطین میں آباد کیا جائے، جس حد تک مطلوبہ مقاصد کے لیے ضروری ہو۔(2) تمام یہودیوں کو ان ممالک کے قوانین کی مطابقت سے مقامی اور عام جماعتوں کی صورت میں بین الاقوامی پیمانہ پر منتخب اور منظّم کیا جائے۔(3) یہودی کے قومی احساسات اور خودی کے جذبات کو تقویت دی جائے۔(4) تحریک صہونیت کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے متعلقہ حکومتوں کی اجازت کے سلسلے میں اقدامات کئے جائیں اور اسرائیل کے قیام کی حمایت کی یقین دہانی کی جائے۔

تحریک صہونیت کی منظّم شکل تو 1897 میں سامنے آئی، تاہم فلسطین کی طرف ہجرت کا سلسلہ 1882 میں شروع ہو چکا تھا۔ روس نے ہجرت کرنے اور ترک عثمانوں نے ان کے فلسطین کے داخلے پر کڑی پابندیاں لگا دیں، لیکن ان احتیاطی اقدامات کے باوجود ان کے کچھ گروہ فلسطین آنے میں کامیاب ہو گئے۔

بن گوریا (جو کہ یہودیوں کا لیڈر تھا) کے نزدیک یہ پہلی ہجرت تھی۔ اس تحریک ہجرت کو بین الاقوامی حیثیت دی گئی اور اس کی ترویج واشاعت کے لیے تنظیمیں قائم کی گئیں۔ چنانچہ 1897 میں جو بال (Ball) کانفرنس منعقد ہوئی اور اس میں جس پروگرام کو متعین کیا گیا، اس کو پورا کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کئے گئے۔ ان میں سے ایک تو یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ عبرانی زبان کو اس کا جائز مقام دیا گیا، اس کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا اور تمام یہودیوں کے لیے یہ لازم ٹھہرایا گیا کہ وہ عبرانی سیکھیں اور اپنے روزمرہ کے معمولات عبرانی میں لکھیں۔

اس بال کانفرنس میں عبرانی زبان کو یہودیوں کے کاروباری اور رسمی زبان کا درجہ دیا گیا گویا یہودی قوم کے سامنے ان کی آئیڈیالوجی (ideology) رکھ دی گئی۔

ہجرت ثانیہ

بال کانفرنس کے بعد 1905 میں دوسری ہجرت ہوئی جسے ہجرت ثانیہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ ہجرت اس بغاوت نما سازش کا نتیجہ تھی جو روس کے خلاف کی گئی اور اسے دبا دیا گیا تھا۔ اس ہجرت میں ان کا لیڈر بن گوریا بھی آیا جو روسی یہودی تھا۔ انہوں نے خلیل سامریہ کے علاقوں میں بہت کالونیاں اور بستیاں قائم کرلیں۔ ان آبادیوں میں یورپ کے متمول یہودیوں کی زبردست اعانت موجود تھی۔

سلطان عبدالحمید خان کی غیرت وحمیت

فلسطین کا علاقہ اس وقت عثمانی ترکوں کی سلطنت میں تھا۔ 1901 میں تھیوڈور ہرزل نے سلطان ترکی عبدالحمید خان کو "حاحام قرہ صوآفندی" کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا: یہودی لوگ ترکی کے تمام قرضے ادا کرنے کے لیے تیار ہیں، اگر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی اجازت دے دی جائے۔

لیکن سلطان نے اس پیغام کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور صاف جواب دیا: "جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک سلطنت ترکیہ موجود ہے، اس وقت تک اس کا امکان نہیں کہ فلسطین یہودیوں کے حوالے کیا جائے۔ اگر یہودیوں کی ساری دولت بھی مجھے دے دی جائے تو ارض مقدس کی ایک انچ بھی ان کو دینے کو تیار نہیں۔ تمہاری ساری دولت کو میں حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں"

1897 سے لے کر 1916 تک تحریک صہونیت نے آباد کاری کے سلسلے میں اہم رول ادا کیا۔ پہلی جنگ عظیم کی ابتدا کے ساتھ یہودیوں کے لیے ہجرت کے مواقع بڑے آسان ہو گئے اور

انہوں نے وسیع پیمانے پر ہجرت شروع کر دی۔ یہ جذبہ اور شوق اسی بال کانفرنس کا پیدا کردہ تھا۔

یہودی اور عرب مسلمان

مسلسل ہجرت کی وجہ سے 1939 میں ان کی تعداد چار لاکھ کے قریب ہو چکی تھی۔ عام عرب آبادی یہودیوں کی دن بدن بڑھتی ہوئی آبادی سے خائف رہنے لگی۔ اس عرصہ کے دوران 1928 اور 1939 میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان خونریز فسادات بھی ہوئے۔

1933 میں عراق، شام اور لبنان کی آزادی کے بعد فلسطینی عربوں نے آزاد ریاست کا مطالبہ کیا، لیکن انگریز حکومت کے وزیر اعظم تسلی دلاسہ دیتے رہے۔ دوسری طرف یہودی عالمگیر جنگ کے زمانے میں فلسطین میں داخل ہونے لگے۔ ان کی مسلح تنظیمیں قائم ہوئیں جنہوں نے اردگرد علاقے میں مار دھاڑ کر کے عربوں کو ہراساں کرنا اور بھگانا شروع کر دیا۔ جن کے مظاہرے سرعام ہوئے تھے۔

تحریک کا دوسرا دور

1917 سے 1947 تک کا دور تحریک صہونیت کا دوسرا مرحلہ تھا۔ یہودیوں نے جو مجلس دفاع ذات قائم کی تھی، وہ عربوں پر حملے کر کے ان کا صفایا کر رہی تھی۔ حتی کہ انہوں نے انگریز سپاہیوں کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ فوج میں یہودی بریگیڈ قائم کیا گیا۔ مختلف علاقوں میں ہونے والے فسادات اتنے نازک صورت اختیار کر گئے کہ نومبر 1947 میں برطانیہ نے فلسطین کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کیا۔ جنرل اسمبلی میں فلسطین کو عربوں اور یہودیوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ ہوا۔

تقسیم فلسطین

فلسطین کا 55: فیصد رقبہ 33: فیصد یہودی آبادی کو اور 45: فیصد رقبہ 67: فیصد عرب آبادی کو دے دیا گیا۔ اس فیصلے کے بعد یہودیوں کو دہشت پسند سرگرمیاں مزید تیز ہو گئیں۔ انہوں نے قتل و غارت اور سفا کی کے ذریعہ ملک کے زیادہ علاقے پر اپنا قبضہ شروع کر دیا۔

1948 میں برطانوی قبضہ فلسطین سے ختم کر دیا گیا۔ ساتھ ہی 14: مئی 1948 کو اسرائیل کی ریاست کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا جسے روس اور امریکہ نے فوراً تسلیم کر لیا۔

اسرائیلی حکومت کے قیام کے بعد عربوں اور یہودیوں میں کئی جنگیں ہوئیں جن میں یہودیوں کا پلہ بھاری رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ استعمار پسند طاقتیں مسلسل یہودیوں کی پشت پناہی کرتی رہی ہیں، نیز یہ طاقتیں ہر طرح ان کی مدد کرتی رہی ہیں۔ یہودی متحد ہیں کیونکہ ان کے ذہن میں ارض موعود کا ایک واضح تصور موجود ہے اور ارض موعود میں قیام حکومت کا عقیدہ ہی یہودیوں کے درمیان باعث اتحاد ہے۔ یہودی جہاں کہیں بھی ہیں، یہودی ریاست کی عملی مدد اور تعاون کرتے ہیں۔ اس کے برعکس عرب ممالک نفاق کا شکار ہیں اور باہم ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہیں۔

عربوں کی ان اختلافات کی وجہ سے اسرائیل اپنے توسیع پسندانہ عزائم میں کامیاب ہو رہا ہے۔ جون 1967 میں اسرائیل نے ہمسایہ عرب ممالک پر حملہ کر کے ان کے کئی علاقے ہتھیا لیے۔ اکتوبر 1973 میں مصر نے اپنے بعض علاقے واپس لے لیے، لیکن چند سال قبل اسرائیل نے لبنان کے اکثر علاقوں پر جارحانہ قبضہ جما لیا۔ اس طرح اسرائیل اپنے توسیع پسندی میں کامیاب ہے۔ 1990 میں خلیجی جنگ میں عراق کی شکست اور روس کا بطور عالمی طاقت کے خاتمہ نے حالات یکسر بدل دیئے ہیں۔

امریکہ اب واحد سپر طاقت ہے۔ اسرائیل مشرق وسطی میں امریکہ کی مضبوط ترین قوت ہے۔ مصر اور تنظیم فلسطین نے اسرائیل کو ایک ملک کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے۔ باقی عرب ممالک اسے تسلیم کرنے پر تیار بیٹھے ہیں۔ ع/ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

قومی مسائل قسط ہشتم

دوقومی نظریہ کا آغاز وفروغ

طارق انور مصباحی

{tariqueanwer313@gmail.com}

ملک ہند کے اختلافی حالات کے پیش نظر سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) بانی مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) نے اردو، ہندی مباحثہ {Urdu-Hindi Controversy} کے بعد انیسویں صدی کے اخیر میں دوقومی نظریہ پیش کیا، پھر مجدداسلام امام احمد رضا قادری (۱۸۵۶ء-۱۹۲۱ء) نے سال ۱۸۹۷ء میں اسی نظریہ کو اسلامی شریعت کی روشنی میں دہرایا۔ دوقومی نظریہ کا تصور اسلامی تعلیم میں موجود ہے۔ انجام کار حالات کو دیکھتے ہوئے الٰہ آباد میں 29: دسمبر ۱۹۳۰ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں مسلم لیگ کے موجودہ صدر، شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال (۱۸۷۶ء-۱۹۳۸ء) نے اپنے یادگار صدارتی خطاب {Monumental Presidential Addrees} میں دوقومی نظریہ {Two-nation Theory} پیش کیا۔ مسلم لیگ نے اس نظریہ کو اختیار کرکے عملی تحریک شروع کی اور پاکستان کا وجود ہوا۔

ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم مصباحی نے رقم کیا: ''تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان نے سب سے پہلے ۱۸۹۷ء میں پٹنہ کے ایک اجلاس میں اس دوقومی نظریہ کی داغ بیل ڈالی، اور ۱۹۲۰ء میں باقاعدہ اس کے متعلق دستاویزات پیش کیں''۔ (ماہنامہ جہان رضا لاہور، جولائی ۱۹۹۵ء: ص ۲۲)

اردو زبان کا آغاز وعروج

ملک ہند عہد قدیم سے مختلف زبانوں، متعدد مذاہب اور نوع بہ نوع تہذیب وثقافت کا گہوارہ رہا ہے۔ اردو کا ابتدائی آغاز اسی وقت سے شروع ہوگیا، جب فاتح سندھ محمد بن قاسم (۶۲ھ-۹۸ھ=۶۸۱ء-۷۱۷ء) کے زیر قیادت سال ۹۳ھ=۷۱۲ء میں ہندوستان میں اسلامی مملکت کا وجود ہوا۔ یہاں کی مقامی زبانوں میں عربی زبان کے الفاظ داخل ہونے لگے، پھر سلطان محمود غزنوی (۳۶۱ھ-۴۲۱ھ=۹۷۱ء-۱۰۳۰ء) ودیگر افغانی سلاطین کے عہد میں فارسی وافغانی زبانوں کے الفاظ نے بھی اس زبان میں شمولیت اختیار کی۔ اس طرح سنسکرت، عربی وفارسی ودیگر افغانی زبانوں کی آمیزش سے رفتہ رفتہ ایک نئی زبان کا ارتقا ہوتا رہا۔ محمود غزنوی سے سلطنت مغلیہ کے عہد اخیر سال ۱۸۳۷ء تک فارسی زبان ملک ہند کی سرکاری زبان رہی۔ سال ۱۸۳۷ء میں برطانوی حکومت {British Government} نے فارسی کی جگہ ''اردو'' کو سرکاری زبان قرار دیا۔ اب انگلش اور اردو یہ دوزبانیں فروغ پانے لگیں۔

سال ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہوتے ہی قوم ہنود نے ملک کو ہندوراشٹر بنانے کا خواب دیکھنا شروع کیا۔ اردو زبان کو ہندوؤں نے مسلم سلاطین کی زبان قرار دیا اور اس سے ناپسندیدگی کا اظہار کرنے لگے۔ اسی زبان کو اگر کوئی ہندو بولتا تو وہ ''ہندی'' کہلاتی، اور اگر کوئی مسلمان بولتا تو اسے ''اردو'' کا نام دیا جاتا۔ رفتہ رفتہ ہندوؤں نے اسی زبان میں سنسکرت کے الفاظ کی کثرت لاکر ایک نئی زبان کی تشکیل کا ارادہ کیا۔ اردو زبان جو فارسی رسم الخط (Persian Script) میں لکھی جاتی تھی، اب اسی زبان کو دیوناگری رسم الخط (Devanagri

Script) میں لکھنے کا مطالبہ ہونے لگا۔اردو، ہندی مباحثہ(Urdu-Hindi Controversy) سے یہ رازِ سربستہ کھل کر سامنے آ گیا اور یہی دوقومی نظریہ کے فروغ کا سبب بنا۔ سال ۱۸۶۷ء سے موجودہ اتر پردیش کے علاقوں میں قوم ہنود نے ''اردو'' کی جگہ ''ہندی'' کو دفتری زبان{Offcial Language} قرار دینے کا مطالبہ شروع کر دیا۔

اردو، ہندی مباحثہ اور دوقومی نظریہ کا آغاز

ایک طویل مدت تک سرسید احمد خاں کا شمار ہندو، مسلم اتحاد کے علمبرداروں میں ہوتا تھا۔ ہندوستان میں دوقومی نظریہ کے بانی سرسید نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میں ہندو اور مسلمان دونوں کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتا ہوں اور ان دونوں کو ایک دلہن کی دو آنکھیں سمجھتا ہوں۔ لفظ قوم سے میں صرف ہندو اور مسلم مراد لیتا ہوں۔ ہم ہندو اور مسلمان ایک ہی سرزمین پر ساتھ ساتھ ایک ہی حکومت کے ماتحت رہتے ہیں۔ ہمارے مفادات ومشکلات مشترک ہیں، اس لیے میں ہندو اور مسلم کو ایک قوم کا دو حصہ تسلیم کرتا ہوں۔ سرسید کے الفاظ یہ ہیں۔

"I look to both Hindus and Muslims with the same eyes & consider them as two eyes of a bride. By the word nation I only mean Hindus and Muslims and nothing else. We Hindus and Muslims live together under the same soil under the same government. Our interest and problems are common and therefore I consider the two factions as one nation."(Urdu-Hindi Controversy wikipedia)

ترجمہ: میں ہندو مسلم، دونوں کو ایک سی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور انہیں ایک دلہن کی دو آنکھیں سمجھتا ہوں۔ لفظ ''قوم'' سے میں صرف ہندو اور مسلم مراد لیتا ہوں، اور ان کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہم ہندو اور مسلم ایک سرزمین پر، ایک حکومت کے ماتحت ساتھ ساتھ زندگی گذارتے ہیں۔ ہمارے فوائد ومشکلات مشترک ہیں، اس لیے میں (مسلم وہندو کو) ایک قوم کا دو طبقہ تصور کرتا ہوں۔

جب سال ۱۹۶۷ء میں اردو، ہندی مباحثہ گرم ہوا، اور قوم ہنود نے اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو سرسید کے خیالات بدل گئے۔ سرسید نے بنارس کے انگریزی گورنر شیکسپیئر(shakespeare) سے کہا تھا کہ اب میں سمجھتا ہوں کہ ہندو اور مسلم کبھی بھی ایک قوم نہیں ہوسکتے، کیونکہ ان دونوں کا مذہب اور طرز زندگی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ سرسید نے کہا تھا۔

"I am now convinced that the Hindus and Muslims could never become one nation as their religion and way of life was quite distinct from one and other."

(Urdu-Hindi Controversy wikipedia)

ترجمہ: اب میں یقین کر چکا ہوں کہ ہندو اور مسلم کبھی بھی ایک قوم نہیں ہوسکتے، اپنے مذہب کے سبب اور طرز زندگی کے سبب کہ بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

سرسید کے اولین سیرت نگار، مشہور شاعر الطاف حسین حالی نے لکھا کہ ایک دن بنارس کے انگریزی کمشنر شیکسپیئر کے ساتھ مسلمانوں کے تعلیمی امور پر سرسید احمد خاں کی گفتگو ہو رہی تھی۔ سرسید احمد خاں کی باتوں کو سن کر شیکسپیئر نے تعجب کے ساتھ دیکھتے ہوئے اسے کہا کہ میں پہلی بار آپ کو خاص کر مسلمانوں سے متعلق بات کرتے ہوئے سن رہا ہوں، ورنہ پہلے تو آپ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کی بات کیا کرتے تھے، تب سرسید نے اس سے کہا کہ اب میں یہ یقین کر چکا ہوں کہ دو قوم کے دل ایک برتن میں نہیں رکھے جا سکتے۔

"One day as Sir Syed was discussing educational affairs of Muslims with Mr. Shakespeare- the then Commissioner of Banaras- Mr. Shakespeare looked surprised and asked him, "This is the first time when I have heard you talking specifically about Muslims. Before this you used to talk about the welfare of the common Indians." Sir Syed then told him, "Now I am convinced that the two cummunities Muslims and Hindus will not put their hearts in any venture together. This is nothing it is just the begining, in the comming times an ever increasing hatred and animosity appears on the horizon simply because of those who are regarded as educated. Those who will be around witness it."

(Syed Ahmad Khan wikipedia)

ترجمہ: ایک دن جبکہ سرسید کی گفتگو مسلمانوں کے تعلیمی امور سے متعلق مسٹر شیکسپیئر سے ہورہی تھی، تب بنارس کے کمشنر شیکسپیئر نے تعجب سے دیکھا اور سرسید کو کہا۔ ''یہ پہلا موقع ہے کہ جب میں آپ کو خاص کر مسلمانوں کے بارے میں گفتگو کرتے سن رہا ہوں، اس سے پہلے آپ تمام ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے گفتگو کرتے تھے۔ تب سرسید نے اس سے کہا۔ اب میں یقین کر چکا ہوں کہ دونوں قومیں ہندو اور مسلم اپنے دلوں کو کسی مشکل کام میں ساتھ نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ یقینی طور پر جلد ہی ہونے والا ہے آنے والے اوقات میں، مسلسل بڑھتی ہوئی نفرت اور دشمنی افق پر ظاہر ہورہی ہے محض ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جو اس وقت ہوں گے، وہ اس کے گواہ ہوں گے۔

گاندھی جی اور اردو زبان

اردو، ہندی اختلاف کو ختم کرنے کے لیے گاندھی جی (موہن دام کرم چند گاندھی- ۱۸۶۹ء- ۱۹۴۸ء) نے سال ۱۹۲۰ء میں کوشش کی کہ ہندی اور اردو کا نام ختم کر کے اسے ''ہندوستانی زبان'' کا نام دیا جائے، اور اس کے لیے دو رسم الخط یعنی فارسی رسم الخط اور دیوناگری رسم الخط کو تسلیم کیا جائے، لیکن گاندھی جی کو کامیابی نہ مل سکی۔ آزادی ہند کے بعد جمہوری حکومت نے سال ۱۹۵۰ء میں ''ہندی'' کو ملک کی قومی زبان (National Language) قرار دیا۔ سلطنت اسلامیہ کے عہد میں بلا تفریق مذہب وملت ہر کوئی فارسی پڑھتا تھا، کیونکہ یہ ملک کی دفتری زبان تھی۔ خود میری ملاقات چند ایسے معمر ہندوؤں سے ہوئی جو فارسی کی مشہور کتابیں گلستاں و بوستاں پڑھے ہوئے تھے۔

چند سالوں قبل ملا رضلع اڈپی (کرناٹک) میں ایک گورنمنٹ اردو اسکول کی سالانہ تقریب میں مجھے افتتاحی خطاب کے لیے مدعو کیا گیا تھا، یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی کنڑ زبان بولنے والے ہندو طلبہ وہاں اردو زبان پڑھتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے ہندوستان کا عہد ماضی یاد آنے لگا۔ زمان ماضی میں اردو زبان کے بے شمار ادبا و شعرا قوم ہنود سے تعلق رکھتے تھے۔ اردو، ہندی مباحثہ کے بعد اردو زبان کا رشتہ قوم مسلم سے جوڑ دیا گیا اور قوم مسلم کی طرح اسے بھی اقلیتی زبان کا درجہ دیدیا گیا اور اسی زبان کو دیوناگری رسم الخط میں لکھ کر اور اس میں سنسکرت زبان کے الفاظ کو بکثرت داخل وشامل کر کے اسے ''ہندی'' کے نام سے ایک مستقل زبان کا درجہ دیدیا گیا۔

دیوناگری رسم الخط

دیوناگری ایک قدیم رسم الخط ہے۔سنسکرت زبان بھی اسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔اس کے علاوہ بھی بہت سی زبانوں کا رسم الخط دیوناگری ہے۔چونکہ ہندودھرم کی قدیم اوراہم کتابیں سنسکرت زبان میں ہیں،اس لیے دیوناگری رسم الخط قوم ہنود کے لیے مذہبی رسم الخط ہوگیا۔جس طرح قرآن مجیدواحادیث مبارکہ کے علاوہ فقہ،تاریخ ودیگر اسلامی علوم کا خزانہ عربی زبان میں ہے،اس طرح عربی زبان اور عربی رسم الخط قوم مسلم کے لیے مذہبی زبان اور مذہبی رسم الخط ہے۔

اب جبکہ ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا خاتمہ ہوچکا تھااورقوم ہنود نے اکثریت کی بنیاد پر ملک کو ہندوراشٹر بنانے کا پلان بنالیا تھا، بلکہ ملک کو ہندوراشٹر بنانے کی خاطر ہی قوم ہنود کے راجے ،مہاراجے ہمیشہ ہندوستان کی سلطنت اسلامیہ کے لیے دردسر بنے رہے۔ مرہٹوں کے حملے بھی اسی مقصد سے شروع کیے گئے تھے۔اب سلطنت مغلیہ کے خاتمہ کے بعدقوم ہنودکو نہ مسلمان ہضم ہورہے تھے،نہ ہی مسلمانوں سے تعلق رکھنے والی کوئی چیز انہیں پسند آرہی تھی۔اب لامحالہ اردوزبان کا فارسی رسم الخط ان کو ہندوستان کی اسلامی سلطنت کی ایک یادگار نظر آرہا تھا،وہ اسے مٹادینا چاہتے تھے۔جب یہ نہ ہوسکا اورقوم مسلم نے اس رسم الخط کی حمایت کی تو پھر مجبوراً انہیں اسی زبان کے لیے دیوناگری رسم الخط کواختیار کرنا پڑا۔یہی سلسلہ آگے بڑھ کر سیکولر ذہن رکھنے والوں کوبھی دوقومی نظریہ اپنانے پر مجبور کردیا۔

اردوزبان سے ہندی کا وجود

سال ۱۸۸۰ء سے ۱۹۹۰ء کے درمیان قوم ہنود نے اردوکو’’دیوناگری‘‘رسم الخط میں لکھنا شروع کیا اوراسے’’ہندی‘‘ کانام دے کر ایک الگ زبان کی شکل دیدیا۔قوم ہنود کے مطالبہ پر سال ۱۸۸۱ء میں برطانوی حکومت نے اردوکودیوناگری رسم الخط میں صوبہ بہار کی دفتری زبان قراردیدیا۔اب اسی اردو کا نام’’ہندی‘‘ہوگیا اور پہلی مرتبہ ہندی کوصوبہ بہار میں دفتری زبان{Offcial Language} کا درجہ ملا ۔ان واقعات سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ہندی زبان کا وجوداردوزبان کے بطن سے ہوا،اور ہندی زبان کے وجود سے صدیوں پہلے اردوزبان کا وجود ہوچکا تھا۔ہاں،سنسکرت ضرور قدیم زبان ہے،مگر سنسکرت اور ہندی دونوں ایک نہیں، بلکہ ایک دوسرے سے متغائرزبانیں ہیں۔

جوقوم مسلمانوں کی زبان برداشت نہ کرسکی،وہ قوم مسلمانوں کو کیونکر برداشت کرسکتی ہے؟ پھر ہمیں غیروں کا منہ تکنے سے کیا فائدہ؟ بھارت میں باعزت زندگی چاہئے تواپنے پاؤں پرکھڑاہونا پڑے گا۔حالات کے جبری تقاضے صاف اشارہ دے رہے ہیں کہ جس طرح شاہ بانوکیس کے وقت سال ۱۹۸۵/ ۱۹۸۶ء میں تمام مسلمان متحد ہوگئے تھے،اسی طرح آج بھی ہمیں ملی وقومی مسائل پراتحاد کی سخت ضرورت ہے۔ہاں،اتحادبھی شرعی دائرہ میں ہو۔اسلام کے تحفظ کے لیےقانون اسلام کی پامالی نہ کی جائے:واللہ الہادی الیٰ سبیل الحق

سیاسی سطح پر دوقومی نظریہ کا آغاز

درحقیقت ہندوراشٹروادی نظریات کے بطن سے دوقومی نظریہ(Two-nation Theory)نے جنم لیا۔آریہ قوم وسط ایشیا سے ہندوستان آئی۔آریوں نے ہندوستان کی قدیم قوم ڈراوڈ کی سلطنت وحکومت پر قبضہ کرکے ہند کی قدیم اقوام کوشودر قراردیا اورشودروں کو اپنا غلام بنالیا۔ایک طویل مدت تک ہندوستان ہندوراشٹر ہی رہا۔پھر بدھ مذہب کوفروغ ملا اور ملک ہند’’بدھ راشٹر‘‘ہوگیا۔بدھ حکومتوں کے کمزور ہونے کے بعد برہمنوں کی کوشش سے ہندوستان دوبارہ ہندوراشٹر بن گیا۔ایک مدت بعد مسلم قوم وارد ہند ہوئی۔ہند کی آریائی اقوام

خصوصاً برہمن قوم، ہند کی سلطنت اسلامیہ کے خلاف ہمیشہ سازش کرتی رہی، یہاں تک کہ 20: ستمبر ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہوگیا۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی (۱۸۲۴ء-۱۸۸۳ء) نے ہندؤں کو جگانا شروع کیا اور ہندو راشٹر کی تجویز پیش کی۔ اس کی تحریروں سے متأثر ہو کر ساورکر نے سال ۱۹۲۱ء-۱۹۲۲ء میں ''ہندوتوا'' (Hindutva) سے متعلق بہت سے مضامین لکھا۔ ان مضامین کا مجموعہ پونہ (مہاراشٹر) سے مئی ۱۹۲۳ء میں ''ہندوتوا'' کے نام سے شائع ہوا۔ ساورکر کی تحریروں سے متأثر ہو کر سب سے پہلے لالہ لاجپت رائے نے اپنے اخبار (News Paper) دی ٹرائبیون (The Tribune) میں میں تقسیم ملک کا علی الاعلان مطالبہ کیا۔ لاجپت رائے نے 14: دسمبر ۱۹۲۴ء کو اپنے اخبار ''دی ٹرائبیون'' میں لکھا۔

"Under my scheme the Muslims will have four Muslim States;(1)The Pathan Province or the North-West Frontier;(2)Westwrn Punjab;(3)Sindh and(4)Eastern Bengal. If there are compact Muslim communities in any other part of India, sufficiently large to form a province, they should be similarly constituted. But it should be distinctly understood that this is not a united India. It means a clear partition of India into a Muslim India and a non-Muslim India."

{The Tribune 14 December 1924}

ترجمہ: میری تجویز کے مطابق مسلمان چار ریاست لیں گے۔ (۱) پٹھان صوبہ یا شمال مغربی سرحدی صوبہ (۲) مغربی پنجاب (۳) سندھ (۴) اور مشرقی بنگال۔ اگر انڈیا کے کسی دوسرے حصہ میں مضبوط مسلم اقوام ہوں، جو اتنا بڑا ہو کہ ایک ریاست کے قیام کے لیے کافی ہو تو اسی طرح انہیں قانونی حیثیت دی جانی چاہئے، لیکن یہ صاف طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ یہ متحدہ بھارت نہیں ہے، اس کا مطلب مسلم انڈیا اور غیر مسلم انڈیا کی ایک واضح تقسیم ہے۔

عبارت مذکورہ بالا سے معلوم ہوا کہ مشہور کانگریسی لیڈر و رکن ہندو مہا سبھا ''لالہ لاجپت رائے'' نے مسلم لیگ کی تحریک پاکستان سے 16: سال قبل ہی تقسیم ہند کی تجویز پیش کردی تھی۔ مسلم لیگ نے لاہور میں 23: مارچ ۱۹۴۰ء کو اپنے سالانہ جلسہ میں مسٹر محمد علی جناح کی قیادت میں قیام پاکستان کے لیے لاہور ریزولیشن (Lahore Resolution) پاس کیا اور مسلم قوم کے لیے ایک الگ ملک کا مطالبہ کیا۔

لالہ لاجپت رائے (۱۸۶۵ء-۱۹۲۸ء) سال ۱۹۲۰ء میں کانگریس کا صدر رہا، سال ۱۹۲۵ء میں ہندو مہا سبھا کا صدر ہوا۔ لالہ لاجپت رائے آریہ سماج کا ممبر، کانگریس کا لیڈر، ہندو مہا سبھا اور ہندو سنگھٹن کا بانی ممبر ہے، لیکن تقسیم ہند کے وقت ہندو مہا سبھا اور آر ایس ایس نے تقسیم ہند کی سخت مخالفت کی اور ملک کو ہندو راشٹر بنانے کی پرزور تحریک چلائی۔ اب ہندؤں کو یہ خوف ستانے لگا تھا کہ برصغیر میں کسی مسلم ملک کا وجود ہندومت کے لیے خطرہ ہے، کیونکہ پڑوسی مسلم ملک، دیگر مسلم ممالک سے مدد لے کر ہندومت کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں، اسی لیے آج تک ہندو تحریکیں پاکستان کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دینے کی خواہش رکھتی ہیں۔ ۱۹۷۰ء/۱۹۷۱ء میں پاکستان کے اندرونی اختلاف میں ہندوستان کی شمولیت اور پاکستان کی مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) و مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) میں تقسیم اسی نظریہ کا شاخسانہ ہے۔

تقسیم ہند کے فطری اسباب

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے قبل حکمرانوں کے باہمی تنازعات تھے اور آپسی جنگیں ہوا کرتی تھیں، لیکن ہندو، مسلم فساد کا کوئی

تصور نہیں تھا۔اسی طرح اکثریت (Majority) واقلیت (Minority) کا نظریہ بھی موجود نہیں تھا۔انگریزوں نے محض اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے ہندوستان کی دونوں بڑی قوموں یعنی ہندو،مسلم میں منافرت کا بیج بویا، جو برطانوی عہد ہی میں خاردار جھاڑیوں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔مسلمانوں کو یہ خوف ستانے لگا کہ کہیں آزادی ہند کے بعد قوم مسلم انگریزوں کی غلامی سے نجات پا کر قوم ہنود کی غلامی میں نہ آ جائے،اور اکثریت کے سبب قوم ہنود،مسلمانوں پر ظلم وستم نہ ڈھانے لگے۔

گرچہ ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب وثقافت اور کثیر مذہبی معاشرت کے سبب ہر قوم کے لیے ملک میں گنجائش موجود تھی،لیکن ہندوؤں کے یہاں ذات پات کا نظام (Caste System) تھا۔ہندو قوم خود ہی نچلی ذات اور اونچی ذات کے ہندوؤں میں منقسم تھی۔جب اپنوں سے نفرت کا جذبہ موجود تھا تو لامحالہ ایک جداگانہ قوم کے لیے خیر خواہی کا جذبہ ضرور شک کے دائرہ میں آتا تھا۔دراصل اہل ہند کی اسی سوچ کے سبب ہندوستان مذہبی بنیاد پر دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے بہت سے علمائے کرام بھی تقسیم کے حامی ہو گئے۔ مسلم لیگ اور تقسیم کے بعد کانگریس کے اراکین کا بھی یہی خیال تھا کہ ہندوستان کی دونوں بڑی اقوام،ہندو اور مسلم کے مابین باہمی تعلقات کی کشیدگی کے سبب ملک کی تقسیم عمل میں آئی،اور تقسیم کے علاوہ دوسرا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔مجاہد آزادی ابوالکلام آزاد نے لکھا۔

"One may orgue that the relations between Hindus and Muslims had become so estranged in India that there was no alternative to partition. This view was held by most of the supporters of the Muslim League and after partition, many of the Congress leaders have held similar views."

(India wins freedom p.247 Published by Orient Longman Limited Madras India)

ترجمہ:ایک بات کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے تھے کہ تقسیم کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔مسلم لیگ کے بیشتر حمایتی یہی خیال رکھتے تھے اور تقسیم کے بعد بہت سے کانگریسی لیڈروں کا بھی ایسا ہی خیال تھا۔

تاریخ کے قارئین سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ برطانوی حکومت بھی تقسیم ہند کی حمایت کرتی رہی،لیکن اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کم ہو جائے،تا کہ یہاں کے مسلمانوں پر اکثریت کا غلبہ حاصل ہو،اور ان پر ظلم وستم ہوتا رہے۔تقسیم سے متعلق ابوالکلام آزاد نے تحریر کیا۔

"The only result of the creation of Pakistan was to weaken the position of the Muslims in the subcontinent of India. The 45 million Muslims who have remained in India have been weakend."(India wins freedom p.247)

ترجمہ:پاکستان کی تخلیق کا واحد نتیجہ برصغیر کے مسلمانوں کو پوزیشن کو کم کرنا تھا۔ساڑھے چار کروڑ مسلمان جو ہندوستان ہی میں رہے،وہ کمزور ہو گئے ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق کے باوجود گاندھی جی کے افکار ونظریات اور ڈاکٹر امبیڈکر،ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو کی کوششوں سے آزاد ہندوستان کے دستور نے وہ صورت اختیار کر لی کہ اسے ساری دنیا میں سب سے بہترین آئین (Constitution) قرار دیا گیا، خاص کر دستور ہند کا ''ابتدائیہ'' (Preamble) اس کے حسن وجمال کی خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے،جس میں ایک سماجی،سکولر،جمہوری، انصاف پرور،مساوات پسند حکومت کے قیام کا عہد کیا گیا ہے۔اب ضرورت ہے کہ قوم مسلم اپنے دستوری حقوق کی حصولیابی کے لیے عملی

کوشش کرے۔ مذہبی رہنماؤں کو بھی بیدار ہونا چاہئے۔ برما لینڈ کے حالات کو دیکھ کر سبق سیکھنا چاہئے۔ غفلت کا دوسرا نام شکست ہے۔

مسلم لیگ نے مسٹر جناح کی قیادت میں قیام پاکستان کے لیے بہت جدو جہد کیا۔ تقسیم ہند کے بعد بھی مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ہندوستان میں رہ جانے والا تھا، لیکن شاید مسٹر جناح نے یہ سوچا کہ کم از کم پاکستانی مسلمان قومی فسادات سے محفوظ رہیں گے۔ کشمیر میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے، اس کے باوجود وہاں نہ مسلمانوں کی جان و مال محفوظ ہے، نہ ہی عزت وآبرو محفوظ ہے۔ حالانکہ عام طور پر کشمیر میں مسلم چیف منسٹر ہوا کرتے ہیں۔ کشمیری مسلمانوں کو دوطرفہ مشکلات کا سامنا ہے۔ ہندوستانی فوج بھی ان کی جان و مال اور عزت و عصمت پر حملہ کرتی ہے، اور دہشت گردوں نے بھی ان کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ پاکستان میں بھی دہشت گردانہ حملوں کے سبب مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان ہوتا ہے، لیکن یہ اہل حکومت کی نااہلی ہے کہ وہ اپنے ملک کو کنٹرول نہیں کر پاتے ہیں۔ نیز ہندو پاک کی باہمی رنجش کے سبب دونوں ملکوں کا ایک بڑا بجٹ دفاعی امور پر خرچ ہوتا ہے، حالانکہ دونوں ملکوں کو ایک ماں کے دو بیٹوں کی مانند رہنا چاہئے۔ اس سے بہتر کوئی نظریہ سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید آج یا کل کچھ ایسی فضا ہموار ہو جائے۔ دونوں حکومتیں بھی ہم آہنگی کے لیے موقع بموقع کوشش کرتی رہی ہیں۔

تقسیم کے وقت برصغیر میں خون ریزیاں

آزادی کے ساتھ ہی ہندوستان دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ تقسیم ہند کے وقت دس لاکھ سے زائد ہندو، سکھ اور مسلم دونوں ملکوں میں ہلاک کیے گئے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ تقسیم سے قبل مخدوش علاقوں میں فوج نہیں رکھی گئی، حالانکہ اس کی تجویز رکھی گئی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کی جلد بازی اور مخدوش حالات سے لاپرواہی نے اہل ہند کو مشکلات میں مبتلا کر دیا۔ ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء-۱۹۵۸ء) نے اپنی کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' میں اس کی تفصیل تحریر کی ہے۔ ہندوستان کے وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل سے بھی کچھ غفلت ہوئی۔ حالات کو کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔

انڈین سیکولرزم اور گاندھی جی

ابتدائی عہد میں کانگریس کے بہت سے لیڈر سیکولر تھے اور متعدد لیڈر فرقہ پرست بھی تھے، پھر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کی قیادت گاندھی جی کے ہاتھ آئی۔ گاندھی جی افریقہ میں 21 سال تک مسلم طبقہ کے وکیل بن کر رہے، اس لیے اسے مسلمانوں سے انسیت ہو گئی اور ذہن میں سیکولرائزیشن آ گیا۔ گاندھی جی کے بعد کانگریس کی قیادت جواہر لال نہرو کو ملی۔ نہرو کا تعلق کشمیری پنڈت گھرانہ سے تھا۔ کشمیر میں مسلمانوں کی کثرت ہے، اس لیے ایک طویل مدت سے کشمیری پنڈتوں کی تہذیب ومعاشرت مسلمانوں کی طرح ہو چکی تھی، اور باہمی موانست کے سبب مسلم دشمنی ذہن میں جاگزیں نہ ہو سکی۔ موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو، دونوں باپ بیٹے سیکولرزم کے روشن مینار تھے۔

ہندوستان اور دستور ہند کی سیکولرائٹی (Secularity) کی بنیاد گاندھی جی کے افکار وخیالات پر ہے، بلکہ ملک کے سیکولرزم میں گاندھی جی کا خون شامل ہے۔ سیکولر ہونے کے سبب ہی ہندو مہاسبھا اور آر ایس ایس کے ممبروں نے گاندھی جی کو ہلاک کر دیا۔ ملک کے سیکولرائزیشن میں ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر امبیڈکر کی کاوشوں کا بھی بہت عمل دخل ہے۔ اسی طرح ہندو انتہا پسندوں سے دستور ہند کو محفوظ رکھنے اور سیکولرزم کو تقویت دینے میں کانگریس پارٹی اور ملک کی دیگر سیکولر پارٹیوں کا بھی بہت اہم کردار ہے۔ بی جے پی درحقیقت آر ایس ایس کا سیاسی حصہ (Political Wing) ہے۔ آر ایس ایس و دیگر ہندو فرقہ پرست تنظیمیں ملک کو ہندو راشٹر بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں۔ اب ''مسلم: دلت = اتحاد'' وقت کی اہم ضرورت بن چکا ہے۔ اس بارے میں مسلم قائدین کو اپنے افکار ونظریات قوم کے سامنے پیش کرنا چاہئے، بلکہ عملی کوشش کی اہلیت رکھنے والوں کو میدان عمل میں حرکت کرنی چاہیے: واللہ الہادی وہو المستعان ☆☆☆

آئینہ

ماہنامہ پیغام شریعت (دہلی) پر بے لاگ تبصرہ

از: نعمان احمد حنفی (پٹنہ)

تبصرہ: شمارہ فروری ۲۰۱۸ء

ایک زمانے کے بعد فروری کے شمارے میں ڈاکٹر مفتی امجد رضا امجد صاحب قبلہ (پٹنہ) کا اداریہ باصرہ نواز ہوا۔ مجلس ادارت میں شامل دیگر اہل علم بھی یوں ہی نوازش فرماتے رہیں تو پھر اس رسالے کی ایک الگ ہی شناخت بنتی جائے گی اور قارئین جدید فکر وخیال کی تازگی سے محظوظ ہوتے رہیں گے، مگر یہ حاضری محض خانہ پری کے لیے نہ ہو، بلکہ اپنے اندر قومی حرکت وانقلاب کا ایک زبردست اقدام اور شعور وآگہی کی ایک نئی سمت لے کر نمودار ہو۔ ڈاکٹر صاحب کو قریب سے جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کس بھاگم بھاگ کی دنیا میں رہتے ہیں، ایسے میں اپنی بے پناہ مصروفیات سے لبریز زندگی میں سے ہم قارئین کے لیے کچھ وقت نکالنا یقیناً ایک احسان عظیم ہے۔

''ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل اور ہمارے ذمہ داران'' ان کے اداریہ کا عنوان ہے۔ اب یہ وہی بتا سکتے ہیں یا پھر کمپوزر بتائے گا کہ ''ذمہ داران'' یہ ذمہ داریاں کی بگڑی ہوئی شکل ہے، یا پھر ذمہ داران ہی ہے۔ نون کا نقطہ محو ہو گیا، آخری صورت ہے تو پھر اتنا کہنے کی جسارت قبول کی جائے کہ ''ذمہ داریاں'' ہی مناسب تھا، کیوں کہ آج برصغیر کے علمائے اہل سنت وجماعت میں سے کسی نے اس طرح کے قومی مسائل کے حل کے لیے ذمہ داری نہیں لے رکھی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ جنھیں ذمہ دار سمجھا جا رہا ہے، وہ بھی والی بال کی طرح ذمہ داریوں کی گیند ایک دوسرے پر پھینکنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسی صورت حال میں انھیں اپنا ذمہ دار سمجھنا فکری معصومیت کے سوا کچھ نہیں۔ ہر ایک کو مرکزیت کا خوبصورت عنوان تو پسند ہے، مگر مرکزیت کس خار دار وادی کا نام ہے اور اس کے لازمی تقاضے کیا ہوتے ہیں، اس سے کسی کو سروکار نہیں۔ چلتے چلتے ڈاکٹر صاحب نے بڑی پیاری بات لکھی ہے۔

''قلم آج بھی رواں دواں ہیں۔ رسالے آج بھی مطالعے کی زینت بن رہے ہیں۔ کتابیں آج بھی شائع ہو رہی ہیں۔ مجلسیں آج بھی گرم ہیں، مگر دیانت داری سے بتایا جائے کہ اس میں کتنا حصہ قومی مسائل کا ہے، کتنا جماعتی المیہ کا اور کتنا حصہ ذاتی مخاصمت کا؟

حقیقت پسندانہ تجزیہ کی روشنی میں دوسری جگہ رقم طراز ہیں: ''گویا اپنی جماعتی جدوجہد کا کل اثاثہ مار آستین کی سرکوبی ہے اور بس، مگر قابل غور پہلو یہ ہے کہ کیا صرف یہی زمانہ کی پکار اور حالات کا تقاضا ہے؟ کیا اس سے مسلک کے متشدد طبقے کی منفی ذہنیت کا ازالہ ہو گیا؟ کیا اسلام پر منڈلاتے ہوئے تاریک سائے معدوم ہو گئے؟ کیا اپنی نسلوں کو پرسکون مستقبل دینے کا خواب شرمندہ تعبیر ہو گیا؟

یقیناً یہ سوالات اہل سنت کے فکری، عملی وروحانی مراکز کے لیے بڑے اہم ہیں۔ جن کا جواب انھیں دینا ہوگا، ورنہ اہل سنت کو جس تیرہ وتاریک دنیا میں لا کھڑا کیا ہے، اس پر مستقبل کی نسلیں انھیں ہرگز معاف نہیں کریں گی۔

بعض اعتقادی اور عملی کمزوریوں کی اصلاح کی کوشش بنام ''اصلاح عقائد واعمال'' کی پانچویں قسط مدنظر ہے۔ حضرت مفتی منیب

الرحمٰن مدظلہ العالی کا نرالا انداز تحریر سابقہ روش کے مطابق علم وحکمت کے موتیاں لٹا رہا ہے۔ انھوں نے خانقاہوں اور آستانوں کے حوالے سے بالخصوص اعتقادیات کے باب میں انتہائی قیمتی باتیں تحریر فرمائی ہیں کہ آستانوں پر ان کے اپنے ہی مشائخ کی تعلیمات کو فراموش کر دیا گیا ہے اور ان کے برخلاف خرافات کو رواج دے دیا گیا ہے۔

اگر قادری حضرت غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ''الفتح الربانی، فتوح الغیب اور سرالاسرار'' پر عمل پیرا ہو جائے تو پھر تنقیص صحابہ سے محفوظ رہے گا۔ اس طرح حضرت سید علی داتا ہجویری کی خانقاہ سے منسلک افراد کشف المحجوب کو سامنے رکھیں تو تمام صحابہ بشمول سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا احترام لازمی کریں گے۔ نقشبندی سلسلے والے اگر مشائخ نقشبند کی کتابیں بالخصوص مکتوبات امام ربانی کا مطالعہ جاری رکھیں تو پھر ان کا کوئی بھی شخص رافضی یا خارجی نہیں بن سکتا۔ چشتی سلسلے والے اگر مشائخ چشت کی کتابیں مثلاً سبع سنابل، فوائد الفواد اور ملفوظات خواجہ تونسوی کو سامنے رکھیں تو یہ بھی رفض میں مبتلا نہ ہوں گے۔ حضرت سلطان باہو کے پیروکار، اگر ان کی دو کتابیں ''عقل بیدار اور نور الہدیٰ'' میں چار چار کی تفریعات مطالعہ میں رکھیں تو رافضیت وخارجیت کی جانب ہرگز میلان نہ ہوگا۔ اسی طرح سہروردی سلسلے والے ''عوارف المعارف'' کا درس اپنی خانقاہوں میں رائج کریں تو کافی حد تک دین کی صحیح تعلیمات سے مریدین ومتوسلین کو روشناس کرایا جا سکتا ہے۔

ابھی جو ہندو پاک میں تنقیص صحابہ بالخصوص کاتب رسول حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں تبرا بازی اور رفض نوازی کی ہوا چل رہی ہے اور پورے سوشل میڈیا پر لعن طعن کا سلسلہ دراز ہے، اس میں دیکھا جائے تو انہی خانقاہوں کے غالی عقیدت میدان پیش پیش ہیں، حالاں کہ ان کے مشائخ نے ہمیشہ سے احترام صحابہ کا حکم فرمایا ہے۔ ایسے میں حضرت مفتی صاحب کی متذکرہ بالا تجویز کی اہمیت مزید دو بالا ہو جاتی ہے۔ اہل خانقاہ پر لازم ہے کہ اس طرح کے فوری اقدام کے ذریعے اپنے وابستگان کا اعتقادی قبلہ درست کریں، ورنہ پھر اسلاف کا سرمایہ بھی رفض وخروج کی نذر ہو سکتا ہے۔

موجودہ پیری مریدی کے جعلی نظام اور رشد وہدایت کی بجائے اسے بدعات ومنکرات کی آماجگاہ بنائے جانے پر چوٹ کرتے ہوئے مفتی صاحب نے بڑی جرأت مندانہ باتیں تحریر فرمائی ہیں۔ اس سلسلے میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محقق بریلوی کے ارشادات گویا سونے پر سہاگہ کا کام کر رہے ہیں۔ اعلیٰ حضرت بریلوی کی شان رہبری پر سو جان سے قربان ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ آخر کیا فراست ایمانی پائی تھی بارگاہ رب العزت سے کہ آج ان کے وصال کو سو سال ہو چکے ہیں، مگر ان کی تحریروں میں آج بھی وہی تازگی اور بانکپن موجود ہے۔ کیا شان ہے کہ ہر نئے فتنوں کی سرکوبی کے لیے امام احمد رضا کی تحریروں میں بے حساب مواد مل جاتے ہیں۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

خدا کی رحمتیں ہوں اے امیر کارواں تم پر ‏ فنا کے بعد بھی باقی ہے شان رہبری تیری

حضرت مفتی صاحب قبلہ نے ایک جگہ شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر پیش کیا ہے:

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کا نشیمن ‏ ترکے میں ملی ہے انھیں مسند ارشاد

یہاں پر ترکے میں ملی کی جگہ ''میراث میں آئی'' ہونا چاہیے کہ اسی میں شعری موزونیت ہے اور الفاظ اقبال کی مطابقت بھی، ورنہ اگر ''ترکے میں ملی'' کو ہی صحیح قرار دینا ہے تو پھر ''انھیں'' کے بعد ''بس'' کا اضافہ کرنا ہوگا، تاکہ کم از کم وزن سلامت رہے۔۔

''<u>امام احمد رضا اور ا کا برامت کا دفاع</u>'' کے عنوان سے مدیر اعلیٰ مفتی فیضان المصطفٰے قادری کی تحریر زینت رسالہ ہے۔ موصوف گرامی کا قلم نہایت سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ زیر نظر تحریر اس سلسلے کی چوتھی کڑی ہے۔ اس بار حضرت حسین بن منصور حلاج علیہ الرحمہ کے تعلق سے اعلیٰ حضرت محقق بریلوی کی توضیحات وتشریحات کا حاصل مطالعہ پیش کیا ہے۔ مدیر اعلیٰ کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر بار ایک نئی زمین کا انتخاب کرتے ہیں اور وہ زمین بھی کوئی نرم وخرام نہیں ہوتی، بلکہ ایک ایسی سنگلاخ وادی ہوتی ہے کہ اس پر اشہب قلم کو تیز گام کرنے کی بات پر بڑے

بڑے ماہرین میدان کا رخ بدل لیتے ہیں: ع/ آفریں برتو اے مرد مرداں آفریں

مولانا سید شہباز اصدق چشتی سہسرامی نے ''اسلاموفوبیا اور مسلمانان عالم'' کے عنوان سے ایک معلوماتی اور تشفی بخش مضمون تحریر کیا ہے۔ پوری تحریر میں سلاست وروانی کا قبضہ ہے، ساتھ ہی اپنی باتوں کو جدید مثالوں سے مزین کرنے کا لہجہ بتا رہا ہے کہ موصوف حالات حاضرہ پر نظر رکھتے ہیں۔ نہ صرف نظر، بلکہ امید وبیم کی کیفیت سے دوچار امت مسلمہ کے لیے ٹھوس لائحہ عمل کیا ہونا چاہئے؟ اس کے لیے بھی مستعد رہتے ہیں۔ ہندوستان میں فقہ حنفی کی اشاعت والے قسط وار مقالے میں جس نازکی کی طرف اشارہ کیا گیا، ابھی اس کے حوالے سے چوکنا ہوتے نظر نہیں آتے، حالاں کہ خود کو معتمد بنانے کے لیے معتمد اور محتاط لوگوں کے اسلوب کو اختیار کرنا از حد ضروری ہے۔ امید ہے کہ آئندہ گزشتہ معروضات پر نظر التفات فرمائیں گے۔

مولانا حسان المصطفیٰ قادری گھوسوی نے ''اردو علامات ومخففات'' پر اچھا لکھا ہے۔ طلبہ مدارس کو اردو قواعد وضوابط کی طرف راغب کرتے ہوئے یہ کہنا نہایت موزوں ہے کہ جب قرآن وحدیث اور دیگر دینی علوم سے منسلک ہونے کے باوجود ہماری تمام تر سرگرمیاں تقریر، تحریر وتبلیغ اردو ہی زبان میں ہوتی ہیں تو پھر اردو ادب سے بے توجہی اور اردو قواعد وضوابط سے بے اعتنائی کیا باعث تشویش نہیں؟ (ص ۳۳) پھر اس حقیقت کو بھی نہ بھولنا چاہیے کہ مدارس اسلامیہ کا اصل مقصد میر وغالب پیدا کرنا نہیں ہے، لہٰذا بقدر ضرورت ہی اردو کی تعلیم دی جانی چاہیے، اس لیے اب اہل مدارس بھی ادھر متوجہ ہوئے ہیں۔ تمام مدارس کا تو مجھے علم نہیں، البتہ جامعہ اشرفیہ مبارک پور جیسے عظیم اداروں نے کچھ سال پہلے اس سمت اقدام کیا ہے اور اسی ضرورت کی تکمیل کی خاطر ایک کتاب'' قواعد املا وانشا'' بھی ترتیب دی گئی ہے۔ اس طرح اب اردو قواعد وضوابط بھی مدارس کے نصاب کا حصہ بن چکے ہیں، پھر جامعہ اشرفیہ کے طریق کار پر عمل کرتے ہوئے دوسرے متعلقہ مدارس نے بھی اس کتاب کو شامل نصاب کر لیا ہے، مگر بہر حال ایسے مدارس کی تعداد قلیل ہے اور توجہ کی ضرورت ہے۔

مولانا حسان المصطفیٰ قادری کا یہ مضمون انتہائی قیمتی اور معلوماتی ہے، مگر پروف کی متعدد غلطیاں مضمون کے حسن کو متاثر کرتی نظر آرہی ہیں۔ چند مقامات کی نشاندہی ملاحظہ ہو (۱) تخلص کی بحث میں لکھتے ہیں (کبھی علامت تخلص نہ لگائیں تو معلوم ہی نہ ہو کہ یہ تخلص ہے یا شعر کا حصہ؟) ایسی صورت میں علامت تخلص ضرور لگائی جائے، تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ لفظ یہاں بطور تخلص ہے۔ (ص ۳۴۱) مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں اس کی مثال میں جو نواز گھوسوی کا شعر پیش کیا ہے، وہ خود ہی علامت تخلص سے خالی ہے۔

(۲) ایک جگہ لکھتے ہیں کہ خاص نام یا خاص جملوں کے اوپر ایک ''متصل لکیر'' کھینچ دی جاتی ہے، اس کا مقصد نشان زدہ لفظ یا عبارت کو ممتاز کرنا اور نمایاں کرنا ہوتا ہے (ص ۳۴) مگر یہاں پر مثال میں لکیر متصل کی بجائے لکیر منفصل موجود ہے۔

اس بحث کے نمبر ۵/ میں ہے کہ کبھی متصل لکیر اعداد کے درمیان لگا کر یہ بتاتے ہیں کہ یہ بحث فلاں سے فلاں صفحے میں پھیلی ہوئی ہے، مگر یہاں بھی جو لکیر ہے، وہ متصل کی بجائے منفصل درج ہے اور پھر اعداد کی ترتیب میں بھی کچھ بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔ یہاں پر مجھے علامہ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ کی وہ بات یاد آرہی ہے کہ جسے انھوں نے ہم نامی کے باعث راویوں میں اشتباہ کی قسموں کو بیان کرتے ہوئے اس کی دوسری قسم مؤتلف ومختلف کی بحث میں لکھا ہے: **وجمع الذهبي في ذلك كتابا مختصرا جدا اعتمد فيه على الضبط بالقلم فكثر فيه الغلط والتصحيف المباين لموضوع الكتاب وقد يسر الله تعالىٰ بتوضيحه في كتاب سميته تبصير المنتبه بتوضيح االمشتبه** (نزھۃ النظر ص ۱۷۸/۱۷۹ مطبوعہ دار ابن جوزی ۱۴۱۳ھ/ ۱۹۹۲ء) یعنی امام ذہبی نے اپنے سے ماقبل لکھی گئی تمام کتابوں کے مضامین کو ایک نہایت مختصر کتاب میں سمونے کی کوشش کی تھی، مگر ضبط بالقلم پر اعتماد کی وجہ سے اس کتاب میں کافی غلطیاں در آئیں، بلکہ تصحیف بھی ہو گئی جو کہ خود موضوع کتاب کے مبائن تھی، پھر امام ابن حجر عسقلانی شافعی کو ''تبصیر المنتبہ'' لکھ کر اس کتاب کے ان

مقامات کی توضیح وتصحیح کرنی پڑی۔

بہر حال یہ کمپوزر اور پروف ریڈر کے تصرفات کی ایک مختصر سی داستان تھی جس پر تھوڑی سی توجہ کے ذریعے قابو پایا جا سکتا ہے۔ چلتے چلتے مولانا نے اس مضمون میں کچھ ایسے جدید قواعد وضوابط کا اضافہ کیا جو دیگر اردو قواعد کی کتابوں میں پائے نہیں جاتے، مثلا اس زمانے میں جملوں کو ممتاز کرنے کا جدید طریقہ کیا ہے؟ فتویٰ نویسی میں پیراگرافنگ کی نئی صورتیں کیا ہوسکتی ہیں؟ سوشل میڈیا پر رائج مخففات جیسے: السلام علیکم کی جگہ A/S یا A/W، اس کے جواب میں وعلیکم السلام کی جگہ W/A، صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کی بجائے .S.A.W رضی اللہ عنہ کی بجائے R.A وغیرہ کے استعمال پر شرعی احکام کیا ہوسکتے ہیں؟ ان امور پر بھی اختصار کے ساتھ اچھی بحث فرمائی ہے۔

مولانا طارق انور مصباحی اس بار تعلیمی مسائل کی گیارہویں قسط ''<u>علوم عصریہ اور اسلاف کرام</u>'' لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ اس میں شہرت یافتہ محقق و مدبر حضرت علامہ سید سلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمہ کی کتاب ''النور'' سے چند اقتباس نقل کر کے مدارس اسلامیہ میں عصری علوم کی شمولیت پر لکھے گئے قسط وار اپنے مضامین وموقف کو مزید پختہ کرنے کی کوشش کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کوشش میں انہیں کامیابی بھی ہاتھ آئی ہے۔ اب دیکھتے رہیے کہ اسلاف کرام کی زنبیلوں اور تاریخی باقیات سے اور کیا کیا ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔

علامہ سید سلیمان اشرف بہاری کی تنقیدی تحریریں ایک حد تک جدید اسلوب کا درجہ رکھتی ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب ''المبین'' کے ذریعے جو مشہور مستشرق گولڈزیہر کی خبر لی ہے، اس سے ان کے تنقیدی لب ولہجے کو پہچاننا آسان ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے اس شوخ تنقیدی اسلوب میں اپنے بہت سے معاصر نقادوں کے مابین بھی امتیازی وصف کے حامل ہیں۔ الفاظ کی شائستگی اور پھر مناسب رکھ رکھاؤ، ساتھ ہی بلند فکری اور فراست ایمانی سے لبریز تحریریں آپ کی کتابوں کو ایک اعلیٰ مقام عطا کرتی ہیں۔ ماہنامہ پیغام شریعت کے اس شمارے میں موجود اقتباسات سے ان کی قومی غیرت وحمیت اور ملی کسک کو قریب سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

قوم مسلم کے ترقی کی دوڑ سے پیچھے رہ جانے کی تباہیوں اور عصری تعلیم سے ملت کی دوری کے سنگین نتائج بیان کرنے کا یہ درمندانہ انداز تحریر منجمد افکار ونظر کو کچوکے لگائے بغیر نہیں چھوڑتا۔ مشرقی درس گاہوں میں تعلیمی تبدیلی لانے سے گریزاں افراد اور حالات وتقاضے کی مشکلات کو دیکھ کر آنکھیں موند لینے والی بچکانہ عادات پر علامہ بہاری سخت نالاں نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے مخصوص تنقیدی لہجے میں ان کی اس غلط روش پر زبردست چوٹ کی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، پھر اس پر مدیر محترم مولانا طارق انور مصباحی کے جا بجا مقدمۃ الجیش کی حیثیت رکھنے والے تبصرے نے تو اس تنقیدی بیانیہ کو اپنے زور قلم سے مزید دوآتشہ بنا دیا ہے ۱۹۲۰ء میں لکھی گئی اس تحریر میں آج بھی وہی تازگی نظر آ رہی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج بھی ''وہی بادہ ہے وہی جام ہے'' والا منظر نامہ موجود ہے۔ آخر ایسی حالت میں کہ مسلم قائدین اور اثر ورسوخ رکھنے والے شیوخ اور علما اجتماعی سطح پر کچھ بات کرنے، بلکہ مشرقی درسگاہوں اور مدارس اسلامیہ کے ترمیمی تقاضوں پر سوچنے تک کے لیے تیار نہیں تو پھر وہاں سے تربیت یافتہ نوجوانوں کو نومیدی کے سوا اور کیا ہاتھ آ سکتی ہے؟؟؟

تبصرہ: شمارہ مارچ ۲۰۱۸ء

موجودہ سنی رسائل وجرائد میں یہ خوش نصیبی ماہنامہ پیغام شریعت (دہلی) کے حصہ میں آئی ہے کہ اس کا اداریہ نہ تو مرثیہ نگاری پر مشتمل ہوتا ہے، نہ ہی آپسی خانہ جنگی کو ہوا دینے والی بے مقصد تحریروں پر۔ مسلم امہ کے اجتماعی مفادات کی کوشش اس کا اولین نصب العین ہے، جس پر اس رسالے کے مشمولات اور اداریے گواہ ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر امجد رضا امجد جیسے ماہر اعتقادیات بھی یہاں کے اداریے میں کھل کر قومی مسائل پر بحث کرتے ہیں تو دوسری طرف مفتی آل مصطفیٰ مصباحی جیسے معروف فقیہ ومفتی بھی اداریہ کے ذریعے ملی مسائل کا تجزیہ

کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا یہ رسالہ کسی کے ذوق وشوق کی تکمیل کے لیے نہیں، بلکہ امت کی ایک ضرورت کی تکمیل کے لیے اپنے ٹھوس لائحہ عمل کے ساتھ ترجیحی بنیادوں پر جاری وساری ہے۔

مارچ ۲۰۱۸ء کے زیر نظر شمارے میں اداریہ حضرت مفتی آل مصطفیٰ مصباحی کا ہے۔ یہ ہم قارئین کی سعادت مندی کہیے کہ اس بار کا اداریہ ہندوستان کے ایک زبردست مفتی ومحقق کے سیال قلم سے لکھا گیا ہے اور کمال تحیر یہ کہ خالص افتائی شخصیت کی اس تحریر میں کہیں بھی افتائی اسلوب کی پیچیدگی اور روکھا پن موجود نہیں ہے۔ اداریہ کا موضوع ہے: ''طلاق ثلاثہ بل: حقائق ومضمرات''۔ اس میں حضرت مفتی صاحب نے اس بل کی دفعات کا جائزہ لے کر اس کی کمزوریوں اور اس کے بطن سے جنم لینے والی خرابیوں کو اجاگر کیا ہے اور پس پردہ حقائق سے نقاب کشائی فرمائی ہے۔ اس حقیقت پسندانہ تجزیہ کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

طلاق ثلاثہ بل کی بعض دفعات کا ہی جائزہ لیجیے تو عجیب وغریب گوشے سامنے آئیں گے جو غیر معقول بھی ہیں اور ظالمانہ بھی، عقل وخرد سے دور اور ظلم سے بھرپور۔ کچھ تو ایسے گوشے ہیں جن کا ادراک ایک عامی بھی کر سکتا ہے۔ (ص ۵) بل کی بعض دفعات کے تجزیہ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ طلاق ثلاثہ بل انتہائی غیر منصفانہ وغیر دانش مندانہ ہے جس میں دیوانی معاملے کو فوج داری قانون کے تحت رکھا گیا ہے۔ مطلقہ عورت کی ہمدردی کے نام پر اس کا زبردست استحصال ہے۔ اس کے بچوں کا استحصال ہے اور ایک شخص کو غیر ضروری سزا دلوا کر اس شخص کے زیر کفالت بہت سے افراد کو زدوکوب کرنے کا ایک ظالمانہ فارمولہ ہے۔ حکومت کا کام دستور وآئین کا تحفظ ہے۔ دستور کے مطابق شہریوں کے حقوق کی حفاظت ہے مذہب میں مداخلت کرنا اور فتویٰ دینا یہ حکومت کی نہ ذمہ داری ہے، نہ حکومت کو اس کا اختیار ہے (ص ۶)

''شیعہ امامیہ اور اصول روایت: عرض ونقد'' کی آخری قسط مفتی ازہار امجدی ازہری نے سپرد قوم کیا ہے جو ترتیبی اعتبار سے چھٹے نمبر پر ہے۔ اس آخری قسط کا ہمیں کئی جہتوں سے انتظار تھا اور یہ میرے بہت سے سوالوں کے جوابات بھی دے گئی۔ اس طرح کے خالص علمی اور تحقیقی مضامین یقیناً علم افزا ہوتے ہیں بشرطیکہ متکلم ومخاطب دونوں اس کے لیے تیار ہوں۔ کبھی کبھی میرا ذہن خود ہی سے سوال کرنے لگتا ہے کہ آخر ہندستان کی سنی صحافت کی تاریخ میں اب تک کسی ایسے مجلّے کا چہرہ کیوں کر سامنے نہ آسکا جس میں خالص علمی اور تحقیقی ذوق رکھنے والوں کا ایک گروہ موجود ہو۔ ادق سے ادق مسائل پر خامہ فرسائی کر کے اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشا جاتا اور ذوق علم وتحقیق کو مزید بلندیوں تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہر محقق اپنی اپنی تحقیقات اور ذہنی اپج کو شرعی اصولوں کی روشنی میں پیش کرتا اور پھر سوچنے سمجھنے کے نئے نئے زاویے سامنے آتے۔ ظاہر ہے کہ ایک عوامی ذہن کا ماہنامہ نہ تو اس طرح کی گنجائش رکھتا ہے، نہ ہی اس کے قارئین ایسے دقیق مسائل کو پڑھنے کے لیے تیار ہوتے ہیں تو پھر اخاذ طبیعت کا مالک اور تحقیقی انسان کہاں اپنی راہ ڈھونڈے گا؟

مقالے کی پیشانی پر محرر کا نام یوں درج ہے: مفتی ازہار احمد امجدی ازہری (فاضل جامع ازہر مصر) یہاں ازہری لکھے جانے کے باوجود پھر ''فاضل جامع ازہر مصر'' کا اضافہ زائد لگتا ہے، کیوں کہ ہندوستان کا پڑھا لکھا طبقہ ''ازہری'' سے مراد یہی لیتا ہے۔ الگ سے بریکیٹ میں اس وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

مولانا جاوید احمد عنبر مصباحی کا مضمون ''حقوق انسانی اور مذہب اسلام'' بھی مختصر مگر جامع ہے۔ تقابل ادیان کے باب میں نوجوانان اہل سنت کے مابین عنبر مصباحی ایک امتیازی حیثیت کے مالک بنتے جا رہے ہیں، لہٰذا اب ان کے پختہ سبق یاد ہونے کے جرم کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں چھٹی نہ دی جائے۔ صاف لفظوں میں کہنا یہ ہے کہ اگر وہ مسلسل لکھنے کے لیے راضی ہوں تو پھر رسالے کو بہ سے بہتر کی طرف لے جانے میں اہم معاون ثابت ہوں گے۔ یہاں پر ان کے مضمون کا چھوٹا سا اقتباس پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جو دراصل آج کے ہندوستان میں فرقہ پرست عناصر کے آلہ کار بنے نوجوانوں کے لیے تریاق کا درجہ رکھتا ہے۔

زور، زبردستی اور خوف یا لالچ کا ایمان واسلام اللہ کے یہاں قبول نہیں ہوگا اور نہ ہی ایسا کرنا صحیح ہے، اس کے عملی ثبوت کے لیے ہندوستان کی تاریخ ہی کافی ہے۔ اگر ایک ہزار سال تک مسلم حکومت کی نگرانی میں تلوار کے زور پر مسلمان بنانے کی مہم چلائی جاتی تو (۱) یا تو آٹے میں نمک برابر مسلمانوں کی حکومت اتنی لمبی مدت تک نہیں چلتی (۲) یا پھر سارے ہندو سرکاری جبر تلے مسلمان بننے (۳) یا جان دینے پر مجبور ہو جاتے، مگر ان تینوں میں کچھ بھی نہیں ہوا۔

(۱) مسلمانوں کی حکومت بھی انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور اندرونی غداروں کی وجہ سے ختم ہوئی، ہندؤں کی مسلح بغاوت سے نہیں (۲) نہ ہر بھارتی مسلمان ہے (۳) اور نہ ہندؤں کی مقدار 80: فیصد سے کم ہے۔ ہر ذی ہوش اس سے نتیجہ نکال سکتا ہے کہ مسلم حکمرانوں نے زور زبردستی اور تلوار سے اسلام پھیلایا ہے یا امن وشانتی سے حکومت کی ہے۔ (ص:۲۱)

اس بار نئے قلم کاروں میں سے دو کے مضامین بے حد پسند آئے۔ ان میں سے ایک مولانا حسان المصطفٰی قادری (گھوسی) کا مضمون ہے، جنھوں نے دلتوں کی بیداری کو دکھا کر خفتہ قوم مسلم کو جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کی ہے اور جن کا عنوان ہے: ''جو اپنوں کا نہیں وہ ہمارا کیسے؟''

اس مضمون کا آغاز فرنگی چالوں سے شروع ہوتا ہے کہ برہمن پیشوا باجی راؤ دوم نے جب انگریزی حکومت کو سالانہ خراج دینے سے انکار کر دیا تو اس کے نتیجے میں انگریزوں نے جنگ کے لیے آٹھ سو سپاہیوں کو میدان میں اتارا، ان میں سے پانچ سو سپاہی شودروں میں سے تھے۔ یہاں پر مولانا گھوسوی نے لکھا ہے کہ انگریزوں نے پہلے ہی شودروں کو برابری کا درجہ دیتے ہوئے اپنی فوج میں شامل کر لیا تھا۔ (ص ۲۳)

مگر یہاں پر شاطر وعیار انگریز قوم کی دوسری چالوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہاں انھیں برابری کا درجہ دینا مقصود نہ تھا، بلکہ ہندوستانیوں کے آپسی بھید بھاؤ اور شودر و برہمن تفریق کا ایک ناجائز فائدہ اٹھانا تھا۔ اصل مقصود یہ تھا کہ یہ برہمن جو شودروں کو ذلیل وخوار اور قابل نفرت گردانتے ہیں، بلکہ منوسمرتی کے مطابق یہ برہمنوں کا ایک اعتقادی حصہ بن چکا ہے کہ شودروں کی تخلیق ہی ذلیل اور گھٹیا کاموں کے لیے ہوئی ہے، فوجی محکمہ کو ان کے سامنے سے دور ہی رکھنا چاہیے تو اگر ان دلتوں اور شودروں کو ڈوبتے کو تنکے کی صورت میں بھی اگر سنبھالا دے دیا جائے تو پھر بہت سے ایسے مواقع پر بھی ہمارے کام آسکتے ہیں جن میں خود ہماری جانوں کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور پھر شودروں سے زیادہ برہمنوں کے مقابلے میں اور کون جنونی ہو سکتا تھا۔

چناں چہ برہمنوں کے بالمقابل اس جنگ میں پانچ سو شودروں کی شمولیت اسی فکر کا ایک شاخسانہ ہے کہ اگر ہم ہار بھی گئے تو زیادہ جانیں تو ہندوستانیوں ہی کی تلف ہوں گی اور جیت گئے تو بھی یہ شودر ہمارے ہی دست نگر بن کر رہیں گے۔ بہر حال جب برہمنوں کے بالمقابل شودر آئے تو انھیں اس بات سے سخت نفرت ہوئی۔ آخر شودروں کے سائے کو بھی نجس سمجھنے والے برہمن جنگ میں انہیں اپنا ہم پلہ کیسے دیکھ سکتے تھے، مگر اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ ناچار میدان میں آنا پڑا۔ 01/ جنوری ۱۸۱۸ء کو آٹھ سو سپاہیوں نے بلکہ کہہ لیں کہ شودروں نے تیس ہزار کے قریب برہمنوں کو ایسی شکست فاش دی کہ انھیں فرار اختیار کرنا پڑا۔ یہ ایک گھٹیا سمجھی جانے والی قوم کی ایک عظیم تاریخی فتح تھی جس نے برہمنوں کے فخر وغرور کا سر نیچا کر کے رکھ دیا۔ اب یہ دلت ہر سال یکم جنوری کو یوم الفتح منا کر اپنے اس باعظمت دن کو یاد کرتے ہیں۔ امسال برہمن وادذہنوں نے آکر پتھراؤ شروع کر دیا اور جشن کو ملیامیٹ کرنا چاہا جس کے نتیجے میں تشدد واحتجاج کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ اس کو مولانا نے تفصیل سے لکھا اور پھر قوم مسلم کی بے حسی پر چوٹ کی ہے۔ پورا مضمون لائق مطالعہ اور عصر حاضر کے مطابق ہے۔

دوسرا مضمون مولانا شاداب امجدی گھوسوی کا ہے جس میں ''دستور ہند میں تبدیلی کی منصوبہ بند سازش'' کو عنوان بنا کر چوٹی کے ہندوستانی سیاسی لیڈران اور فرقہ پرستوں کے نمائندوں کے بیانات کی روشنی میں آٹھ تاریخی وتحقیقی شواہد کے ذریعے اپنے موقف کو پختہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اخیر میں یہ تجزیہ پیش کیا گیا ہے کہ ''سب کا ساتھ سب کا وکاس'' کا نعرہ لگا کر ایک بھیانک چہرے کو چھپانے اور منظم

طریقے سے اقلیتوں کے حقوق سلب کرنے کے لیے جال بچھایا گیا ہے اور دوسری طرف اکثریتی طبقہ کافی حد تک ان کے دام فریب میں بھی آ چکا ہے، پھر اس پر راحت اندوری کا یہ شعر بھی دل کو چھو گیا:

گلدستے پر یک جہتی لکھ رکھا ہے　　گلدستے کے اندر کیا ہے سچ بولو

''ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے'' کے عنوان سے مولانا اشرف جیلانی (اکبر پور: یوپی) نے حج سبسڈی پر موافق ومخالف دلائل کا اچھا جائزہ لیا ہے اور پھر پاکستان کے صوبہ پنجاب کے شہر قصور کی ایک چھ سالہ ننھی زینب کی آبرو ریزی اور قتل کا دلدوز واقعہ اور اس کے اسباب وعوامل پر روشنی ڈالتے ہوئے جو لبرل زدہ معاشرے کو سنبھلنے کا پیغام دیا ہے، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ سوچنے کی بات ہے کہ آخر زینب کا قصور کیا تھا؟ کیا اس کا قصور یہ تھا کہ وہ تنہا قرآن پاک پڑھنے کے لیے گھر سے نکلی تھی؟ کیا اس کا یہ قصور تھا کہ وہ حد درجہ کمسن اور ناسمجھ تھی؟ یا وہ ہوس پرست انسانوں نہ پہچان سکی؟ حقیقت تو یہ ہے کہ قصور، شہر قصور کی بیٹی زینب کا نہیں، بلکہ اس لبرل اور بے حیا معاشرے کا قصور ہے جس نے شیطان صفت زانیوں کی پرورش کی ہے۔ قصور اس اپاہج اور مفلوج ذہنیت کا ہے جو اسلامی نظام قانون کو سخت گیر کہہ کر اس کا مذاق اڑا رہی ہے، بلکہ قصور اس قانون کا ہے جو کمزوروں کو پل بھر میں تختہ دار پر چڑھا دیتا ہے اور سفید پوش خاطیوں تک اس کے لمبے ہاتھ نہیں پہنچ پاتے (ص ۴۲)

عنوان ''ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے؟ کافی مبہم سا لگا۔ عنوان کو کم از کم اتنا واضح ہونا چاہیے کہ اسی کو پڑھ کر انسان یہ اندازہ لگا لے کہ اندر کیا ہو سکتا ہے، خاص طور سے اس دور میں جب مبہم عناوین اور اشارات پر مشتمل عناوین متروک ہوتے جا رہے ہیں۔ کون یہ جان سکتا ہے کہ اس کے اندر موجودہ ہندوستانی مسئلہ حج سبسڈی کے بارے میں لکھا گیا ہوگا۔

مولانا شفق قادری فیضی (کولکاتا) کا مضمون ''علمائے کرام کے مختلف معاشی طبقات'' بھی معلوماتی ہے، مگر بہت سی باتیں انھیں سوالات کے گھیرے میں لا کھڑا کر سکتی ہیں، اس لیے تھوڑی سی محنت وتوجہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ''جامعہ اشرفیہ مبارکپور اور حسام الحرمین'' کے عنوان سے مولانا فیضان سرور مصباحی نے سوشل میڈیا پہ گردش کرنے والے ناظم تعلیمات حضرت علامہ محمد احمد مصباحی جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے حالیہ نو فارغین کی فتنہ سامانیوں پر تنبیہ نامہ شائع کروایا ہے، جو تفویض سند کے وقت جامعہ اشرفیہ کے عہد واثق سے متعلق ہے۔ اچھا ہوا کہ یہ چھپ کر تاریخ کا حصہ بن گیا، مگر مولانا موصوف سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اس سے بڑھ کر بھی قلمی طور پر حصہ لیں گے۔

''دینی علوم اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی'' پر مولانا ہاشم رضا امجدی متعلم جامعہ امجدیہ رضویہ گھوسی کا مضمون بھی پسند آیا، مگر جگہ جگہ انگریزی الفاظ کا بے جا استعمال بتا رہا ہے کہ موصوف کو ابھی اردو میں اور محنت کرنی ہوگی، تاکہ دوسری زبان کی خیرات سے اردو زبان کو ایک حد تک پاک رکھا جا سکے۔

تعلیمی مسائل کی گیارہویں قسط مفکر اسلام حضرت علامہ سید سلیمان اشرف بہاری کی کتاب ''النور'' کی روشنی میں لکھی گئی تھی اور اس بار انھیں کی ایک اور کتاب ''السبیل'' کی روشنی میں مدارس اسلامیہ کے نصاب کے حوالے سے ممکنہ پہلوؤں پر غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے، جس کے اندر ماضی میں اس حوالے سے کیا کیا اقدامات ہوئے اور پھر سود وزیاں کی صورت میں اس کا نتیجہ کیسا رہا؟ اسباب وعوامل کیا تھے؟ ودیگر امور پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ حضرت سید سلیمان اشرف بہاری کی تحقیق کے مطابق سب سے پہلے مدرسہ احمدیہ آرہ (ہند) میں مشترکہ نصاب اور صرف ونحو کی کتابوں کی تسہیل کی کوشش ہوئی، انگریزی زبان کا سکھانا لازم قرار پایا۔

اس کے بعد مجلس ندوۃ العلما قائم ہوئی جس نے کچھ زیادہ اہتمام کے ساتھ مسئلہ تعلیم کے ہر پہلو پر غور وخوض کرنا شروع کیا۔ پروفیسر مسعود احمد مظہری متوفی ۲۰۰۸ء: لکھتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محقق بریلوی بھی مدارس اسلامیہ کے نصاب میں عصر حاضر کے تقاضوں

کے مطابق تبدیلی کے نہ صرف قائل تھے، بلکہ اس مقصد کے لیے مجلس ندوۃ العلما مدرسہ فیض عام کانپور کے ایک اجلاس میں شرکت فرما کر باضابطہ اصلاح نصاب کے موضوع پر ایک مقالہ بھی پڑھا تھا۔(ص۳۴)اس طرح کے تاریخی حقائق کو مولانا طارق انور مصباحی نے بڑی تفصیل سے لکھ کر ارباب فکر ونظر کو غور وفکر کی دعوت دی ہے اور ذمہ داران مدارس سے درمندانہ انداز میں اس طرف قدم بڑھانے کی بھی اپیل فرمائی ہے۔ذرا ایک تلخ ،مگر مبنی برحقیقت اقتباس ملاحظہ ہو۔ذرا دیکھیں کہ کس خوش اسلوبی سے ذمہ داران کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔

''علما ومشائخ غور فرمائیں کہ وہ اپنے شہزادگان کو مدارس عربیہ کی بجائے انگلش میڈیم اسکول میں کیوں بھیجتے ہیں؟اگر مدارس میں مشترکہ نصاب تعلیم نافذ ہو،اور اسکول وکالج کے امتحانات کا نظم ہو تو دین کے ساتھ فارغین مدارس کا دنیاوی مستقبل بھی روشن ہوسکتا ہے۔یہ فارغین مدارس ان شہزادگان سے بہتر ہوں گے جو انگلش میڈیم اسکولوں میں تعلیم پاکر دنیاوی علوم تک محدود رہتے ہیں۔مجھے شہزادگان کی ترقی وفلاح پر بھی خوشی ہوتی ہے۔ہاں،دوسروں کی بھلائی کی بھی فکر کی جائے۔مدارس کے ذمہ داران بھی اپنے بچوں کو مدارس اسلامیہ میں تعلیم کے لیے داخل نہیں کرتے۔آخر مدارس میں کمی کیا ہے؟ کیا اس کمی کو دور کرنا بہت مشکل ہے۔اگر آسان ہے تو ان خامیوں کو دور کون کرے گا؟ کیا اس خامی کو دور کرنے کے لیے بھی کسی مجدد کی ضرورت ہوگی؟ مدارس کے نظام تعلیم میں کچھ کمی محسوس کر کے اپنے شہزادوں کو مدارس سے جدا رکھتے ہیں،لیکن ان خامیوں کو دور کرنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔اس کی وجہ خود ساختہ مفکرین کا خوف ہے۔(ص۳۷)

چلتے چلتے مولانا نے تحفظ ناموس رسالت علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی خاطر ایک عظیم قلمی سلسلہ شروع کرنے کا اور تعلیمی مسائل کے فی الحال موقوف کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔مولانا موصوف نے لکھا کہ اب ارباب شوق واصحاب ذوق تعلیمی مسائل کے بارے میں انہی برجوں میں گشت لگاتے رہیں۔رب تعالیٰ کی مرضی مبارک ہوئی تو یہی بارہ قسطیں خدا کی رحمتیں لے کر آئیں گی: وماذلک علی اللہ بعزیز

مولانا نے اپنے دوسرے مضمون ''<u>مستقبل کے عزائم</u>'' میں بجنوری ذہن کے افراد اور ان کی تخریب کاریوں کا پردہ چاک کرنے کا عندیہ دیا ہے۔ہم اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ذیل کے اقتباس میں جس فیشن زدہ نوجوانوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،امید ہے کہ انھیں کچھ سنبھلنے کا موقع ملے اور غور کرنے کے بعد وہ اپنے نظریات پر نظر ثانی کر سکیں۔مولانا موصوف نے لکھا:

''عہد حاضر میں ایک نیا فیشن بن چکا ہے کہ لوگ مذہب اہل سنت وجماعت کے معتقدات کا انکار کسی کا نام لے کر کرتے ہیں مثلاً اعلیٰ حضرت نے ایسا فرمایا ہے اور ہم اعلیٰ حضرت کو نہیں مانتے۔اعلیٰ حضرت کو ماننا الگ معاملہ ہے اور اعلیٰ حضرت کے معتقدات کو نہ ماننا الگ معاملہ ہے۔اعلیٰ حضرت مذہب اہل سنت وجماعت کے معتقدات ومسلمات پر قائم تھے۔اب اگر کوئی اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے کسی عقیدہ کا انکار کرتا ہے تو وہ مسلک اہل سنت وجماعت کے عقیدہ کا منکر ہے۔اس کا حکم وہی ہوگا جو مذہب اہل سنت وجماعت کے کسی عقیدہ کے منکر کا حکم ہے''۔

مولانا موصوف نے لکھا: مذہب اسلام کے کسی عقیدہ کا محض اس لیے انکار کر دینا کہ فلاں نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے،ایک عجیب وغریب بات ہے۔یہ شعر کتنا برمحل ہے:

ایسی ضد کا کیا ٹھکانہ دین حق پہچان کر
ہم ہوئے مسلم تو وہ مسلم ہی کافر ہو گیا

اللہ تعالیٰ ماہنامہ پیغام شریعت اور اس کے منتظمین وقلم کاران کو سرخروئی عطا فرمائے اور اس رسالے کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے: آمین بجاہ النبی الکریم علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والتسلیم ☆☆☆☆☆☆

دبستانِ ہفت رنگ

مشائخ اہل سنت کے مکتوبات، قارئین ’’پیغام شریعت‘‘ کے تأثرات، دانشوران قوم وملت کی فکری تحریریں، ارباب علم وفضل کے مختصر مقالات کے لیے مستقل کالم۔ای میل: tariqueanwer313@gmail.com

ممکن ہے اتحاد بھی شرط عمل کے ساتھ

از: مولانا محمد شاہد علی قادری مصباحی (باگی، جالون: یوپی)

آج امت مسلمہ اختلاف وانتشار کے ایسے بحر عمیق میں غوطہ زن ہے کہ ساحل نجات تک کوئی کرشمہ ہی پہنچا سکتا ہے۔ معاملات ایسے پیچیدہ ہوئے کہ اختلافات کا بھنور علمائے اکابر کی شخصیات سے متجاوز ہو کر صحابہ کرام کے نفوس طیبات تک جا پہنچا۔

لیکن احباب نے اب بھی ہوش کے ناخن نہ لیے اور کبھی کبھی تو لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے سلسلہ یا ہمارے نظریہ کے خلاف کسی نے کچھ بات کہی ہے تو بس پڑ گئے اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر، یہ بھی نہ سوچا کہ ہم اپنے مد مقابل کے بغض وعناد میں ایسے غلطاں ہیں کہ ہمیں یہ بھی ہوش نہیں کہ اپنے مخالف کی تردید میں صحابہ کرام پر بھی انگشت نمائی کر بیٹھے۔

ہم میدان محشر کے متعلق سنتے آئے ہیں کہ نفسی نفسی کا عالم ہوگا، مگر یہاں بھی ایک محشر بپا ہے اور یہاں بھی نفسی نفسی کا عالم ہے۔ یہ نفس پرستی کا محشر ہے۔ نفس پرستی میں ایسے مبتلا ہو گئے ہیں کہ ہمیں اپنے نفس کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ہم، ہمارا، ہم سب، ہماری قوم، ہمارے اسلاف کی جگہ میں، میرا، فقط میرا، میرا سلسلہ، میرا مرشد، میرا گروہ جیسے الفاظ نے لے لیا۔

میرے بھائی! یہ تکبر، یہ نفس پرستی کس کام کی؟ یاد رکھو! یہ ایوان نما خانقاہیں، یہ بادشاہوں کو بھی شرمندہ کر دینے والی شان وشوکت اور مریدین کی شکل میں غلام انعام جاودانی اور سرمایہ دائمی نہیں ہیں۔ کسی فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

چنانکہ دست بدست آمد ست ملک بنا		بدستہائے دگر ہم چنیں بخواہد رفت

اپنے اپنے عالیشان محلات اور ایوان نما خانقاہوں کے در و دیوار کو صحابہ کرام اور اکابرین اسلام کی بے حرمتی کے کالے پانی سے چمکانے کی ناکام کوششیں کرنے والو یاد رکھو!

بزرگش نہ خوانند اہل خرد		کہ نام بزرگاں بزشتی برد

کسی کے بلند مرتبہ اور عظیم منصب سے حسد کرنے والو! کبھی یہ نہیں سوچا کہ انہیں وہ بلند مرتبہ اور عظیم منصب کس نے عطا فرمایا ہے؟ ارشاد ربانی دیکھو: {اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَا اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ}

یا لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس پر جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمایا۔

اور جسے اللہ بڑھائے اسے کون گھٹا سکتا ہے؟ اسی لیے امام اہل سنت اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز نے فرمایا:

تو گھٹائے سے کسی کے نہ گھٹا ہے نہ گھٹے		جب بڑھائے تجھے اللہ تعالیٰ تیرا

نفوس طیبات پر کیچڑ اچھالنا سورج پر سیاہی پھینک کر اسے بدنما بنانے کی کوشش ہے۔ اس سے سورج کو تو کوئی فرق پڑنے والا نہیں،

البتہ تمھارے ہی منہ کالے ہونے کا یقین کامل ضرور ہے۔ تمھاری ان ریشہ دوانیوں سے عوام اہل سنت میں کافی اضطراب اور خلفشار پیدا ہو چکا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو کچھ مدت بعد یہی اختلافات عوام کو علماے کرام اور پیران عظام سے بیزار ضرور کر دیں گے، بلکہ اس کے واضح آثار رونما ہو چکے ہیں۔ ان تمام اختلاف وانتشار کی بنیاد حسد وبد گمانی ہے۔ ایک عالم دوسرے عالم کی مقبولیت کا حاسد ہے۔ ایک پیر دوسرے پیر کی قبولیت کو برداشت نہیں کر پاتا ہے۔ ہم عدم تحمل کے ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ عوام اپنے رہنماؤں کو دیکھ کر دیگر علما ومشائخ سے بدظنی اور حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بدگمانی وبغض وحسد سے متعلق اسلامی تعلیمات درج ذیل ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: {اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ} ترجمہ: زیادہ بدگمانی سے بچو۔

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: {عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ وَلَا تَحَسَّسُوا وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا تَنَاجَشُوا وَلَا تَحَاسَدُوا وَلَا تَدَابَرُوا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَكُونُوْا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا} (صحیح البخاری)

ترجمہ: حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بدگمانی سے بچتے رہو۔ بدگمانی (تحقیق کے بعد) اکثر جھوٹی بات ثابت ہوتی ہے اور کسی کا عیب ڈھونڈنے کے پیچھے نہ پڑو۔ کسی کا عیب خواہ مخواہ مت ٹٹولو، کسی کے بھاؤ پر بھاؤ نہ بڑھاؤ، حسد نہ کرو، کسی کی پیٹھ پیچھے برائی نہ کرو، اور بغض نہ رکھو، بلکہ سب اللہ کے بندے آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔

اس حدیث پاک کا ایک ایک لفظ ایسا ہے جس پر عمل کر کے ہم تمام اختلافات کو جڑ سے اکھاڑ پھینک سکتے ہیں۔ ایک اور چیز ہے جو ہمارے مابین تفریق کو بڑھانے میں ایسا کام کرتی ہے جیسا آگ میں گھی، اور وہ ہے کسی کے عیوب کی تشہیر۔ ہمیں اگر کسی کی کوئی بات معلوم ہو جائے تو ہم اسے ہر ممکن ذریعہ ابلاغ سے پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ ہمارے پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم اس کے برخلاف ہے۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے:

{عَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ—مَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللَّهُ فِي حَاجَتِهِ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللَّهُ عَنْهُ بِهَا كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ} (صحیح مسلم)

ترجمہ: حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کی مدد چھوڑتا ہے، اور جو اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا ہو، اللہ اس کی حاجت پوری کرنے میں لگا ہوتا ہے۔ جو اپنے کسی مسلمان کی پریشانی دور کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس سے قیامت کی پریشانیوں میں سے کوئی پریشانی دور فرما دے گا اور جو کسی مسلمان کے عیب پر پردہ ڈالے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیب پر پردہ ڈالے گا۔

اگر آپ کسی کے عیب کی پردہ پوشی کرتے ہیں تو دنیاوی فائدہ یہ کہ وہ آپ سے بدظن نہ ہوگا اور اخروی فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ روز قیامت آپ کے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ یہ عظیم اجر ہے۔

اگر ہم صرف ان دو احادیث کریمہ پر عمل پیرا ہو جائیں تو ہمارے درمیان سے اختلاف ایسا ختم ہو جائے گا جیسے ترشی سے نشہ کافور ہو جاتا ہے۔ آخر ان اختلافات نے ہمیں کون سا فائدہ دیا؟ ہمارے مسلسل اختلافات کے سبب اغیار کو ملک بھر میں پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا۔ اگر ذمہ داران اس جانب توجہ نہیں دیتے تو اب پیروکاران کو خود ہی صحیح راہ کا تعین کر لینا چاہئے۔ ہمارے لیے خدا اور رسول (عزوجل وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے احکام قابل عمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ بے نیاز میں التجا ہے کہ وہ ہم سب سنیوں کو ایک اور نیک بنا دے: آمین ثم آمین

فروغِ فکر اسلامی کے لیے امام احمد رضا کی خدمات کے چند نقوش

از: غلام مصطفیٰ رضوی (نوری مشن: مالیگاؤں)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی ماہر علوم جدیدہ وقدیمہ تھے۔آپ نے ہر علم وفن میں گراں قدر تصانیف قوم کو عطا فرمائی۔ آپ کی تصنیفات میں وہ گہرائی وگیرائی ہے کہ کسی موضوع پر تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔موضوع سے متعلق سیر حاصل مواد عنایت فرما دیتے ہیں۔ جو مسئلہ بارگاہِ اعلیٰ حضرت میں پیش ہوتا، اس کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کر لیتے اور استدلال کے ساتھ حکم اسلامی واضح فرماتے۔علمی وفکری گہرائی اور درا کی کا اعتراف بڑے بڑے اربابِ علم وفن نے کیا ہے۔ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نقشبندی کے بقول:

''ان کے فضل وکمال، ذہانت وفطانت، طباعی ودرا کی کے سامنے بڑے بڑے علما، فضلا، یونی ورسٹی کے اساتذہ، محققین اور مستشرقین نظروں میں نہیں جچتے۔'' (کلام رضا، اصغر حسین نظیر لدھیانوی، ص۵)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کا علمی سرمایہ جو ہزار کے لگ بھگ کتب ورسائل وحواشی وشروح پر مشتمل ہے۔ان میں کثیر علمی جہات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ سرمایہ قابلِ قدر، وقیع اور حوصلہ افزا ولائق فخر ہے۔ایسے مایوس کن حالات میں جب کہ یورپ نے مادی وسائنسی ترقیات کے سہارے مسلم قوم کو زوال سے دوچار کر کے اپنا مرہونِ منت بنانا چاہا، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے ماضی کی قابلِ فخر اسلامی تاریخ وروایت سے ہمارا رشتہ استوار کرایا، اور علمی تحقیقات پر مشتمل ایسی نگارشات عطا کیں جن سے استفادہ کر کے ہم مشرقی علوم وفنون کی اعلیٰ ترین قدریں مغرب کے غیر اسلامی نظریات کے مقابل واضح کر سکتے ہیں۔

موضوعاتی اعتبار سے تصانیفِ رضا کی تین رُخ سے تقسیم کی جا سکتی ہے، اس بابت مولانا محمد احمد مصباحی رقم طراز ہیں: ''چودھویں صدی کے مجدد امام احمد رضا قادری بریلوی علیہ الرحمہ (۱۲۷۲ھ-۱۳۴۰ھ) کی تصنیفات تین اہم حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں جس کی روشنی میں ان کی تجدیدی، اصلاحی اور علمی خدمات کا اجمالی نقشہ سامنے آجاتا ہے:

(۱) اصلاح عقائد اور تصحیح نظریات (۲) اصلاح اعمال اور تصحیح عادات (۳) علمی افادات اور فنی تحقیقات

(تقریب: تصانیف امام احمد رضا، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی، ص۳)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے علمی افادات اور فنی تحقیقات کا ایک اہم حصہ علومِ عقلیہ، سائنس وفلسفہ کی اصلاح پر مشتمل ہے۔بیسویں صدی میں مغرب کے غلبے کی عمومی وجہ سائنسی ترقیات سمجھی جاتی تھی، اس لیے آپ نے قرآنی پیغام عام کرنے کے لیے سائنس کے خلافِ اسلام نظریات کی اصلاح کی اور اس بابت متعدد کتب ورسائل لکھے، جن میں یہ فکر عطا کی کہ قرآن کی روشنی میں سائنس کو پرکھا جائے، سائنس کی روشنی میں قرآن کو نہیں، نومسلم ڈاکٹر محمد ہارون اس رُخ سے فرماتے ہیں:

''امام احمد رضا کے نزدیک قرآن اور اسلام ہی میں کامل سچائیاں ہیں اور کسی بھی طرح ان کی تردید کی اجازت نہیں دی جا سکتی......اگر کبھی سائنس دانوں نے ایسا کیا بھی تو امام احمد رضا نے ان کے دلائل کو اسلامی دلائل سے رد کیا اور ان کے پرخچے اڑا دیے......اس طرح امام احمد رضا سائنس میں بھی عظیم تھے......''۔(امام احمد رضا کی عالمی اہمیت، طبع مالیگاؤں، ص۸)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا مسلمانوں کے رشتے کو سائنس وحکمت سے جوڑ کر اس وقار کو بحال کرنے کے خواہش مند تھے جو بغداد وقرطبہ

کی تباہی کے بعد مسلمان کھو چکے تھے، اور جس فکر کی بنیاد قرآن مقدس، احادیث نبوی اور علمائے اسلام کی تحقیقات علمیہ پر تھی۔ ماضی کا مطالعہ گرچہ تلخی بھی رکھتا ہے لیکن گزری صدی (۲۰ رویں صدی) میں عالمِ اسلام بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کو اعلیٰ حضرت جیسی قیادت میسر آئی۔ یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام و اکرام ہے۔ انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی اسلام آباد کے پروفیسر جمیل قلندر کا یہ ریمارک قابلِ غور ہے:

''تقسیم پاک و ہند سے پہلے ہندوستان میں علامہ امام احمد رضا خاں بریلوی دینی پلیٹ فارم پر غالباً وہ واحد شخصیت نمودار ہوئے، جنھوں نے نرے اسپیشلائزیشن کی روش سے ہٹ کر علوم وفنون کے بارے میں وہی انسائیکلوپیڈیائی، موسوعاتی، انٹرڈسپلینری اور ہولسٹک رویہ اپنایا جو مشرق کے قدیم سائنس دانوں، فلسفیوں، علما، فقہا، اور مؤرخین کا وطیرہ اور معمول رہا ہے۔'' (معارف رضا سالنامہ ۲۰۰۳ء کراچی، ص ۸۵)

ایک عرصے سے متعصب فکریں پروپیگنڈوں اور اتہامات کے سہارے فکرِ رضا سے اہلِ علم و دانش کو دور کرنے میں لگی ہوئی ہیں، اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ خالص علمی انداز میں ان کا جائزہ لے لیا جائے۔ اس عنوان پر کام کی ضرورت ہے، تا کہ مسلمان ایک صاحب بصیرت مفکر کی فکر سے استفادہ کر کے علمی خدمات کی انجام دہی کر سکیں۔

فکر اعلیٰ حضرت کی اشاعت و توسیع مسلم اُمہ کے لیے وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اصحابِ قلم کو چاہیے کہ تصانیفِ اعلیٰ حضرت بالخصوص ''فتاویٰ رضویہ'' کا مطالعہ کریں اور قوم کی تعمیر و ترقی، تعلیمی و فکری رہنمائی کے لیے لائحۂ عمل ترتیب دیں اور ماضی کی شان دار اسلامی روایات سے حال کا رشتہ استوار کر کے یاسیت کے اندھیروں کو دور کریں اور شریعت اسلامی کی صحیح راہوں کی ترغیب و ترسیل کے لیے ذہن سازی کریں۔

ہے ان کے عطر بوئے گریباں سے مست گل
گل سے چمن، چمن سے صبا اور صبا سے ہم

دنیا نہیں مردان جفاکش کے لیے تنگ

مولانا محمد زاہد علی برکاتی مرکزی (باگی، جالون: یوپی)

کافی طویل عرصہ بعد ایک خوش کن خبر علما کے تعلق سے موصول ہوئی۔ شیخ ابوبکر باقوی بانی مرکز الثقافۃ السنیہ (کالی کٹ کیرلا) کی کاوشوں کا نتیجہ ہم سب اپنے سر کی آنکھوں سے مسلسل دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے محدود فکر کی زنجیروں کو توڑتے ہوئے ایک نئی تاریخ رقم کر ڈالی اور علمائے کرام کو وکالت کے شعبے کی طرف رغبت دلائی۔ 10: علما کا حال ہی میں کیرالہ ہائی کورٹ میں رجسٹریشن ہوا۔ حالیہ سالوں میں علما دینی تعلیم سے فراغت کے بعد یونیورسٹیوں کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور ہر چہار جانب اپنی علو ہمتی اور علمی لیاقت کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ میں اکثر اپنے احباب سے کہا کرتا ہوں کہ جتنی محنت و مشقت علما درسی کتابوں میں کرتے ہیں، اگر اس سے آدھی کوشش وہ IAS / IPS کے امتحانات میں کریں تو ہمارے ہر بڑے مدرسے سے دو چار آئی اے ایس بآسانی نکلیں اور بہت جلد ہر محکمے میں ہماری نمائندگی دکھائی دے۔

عام قارئین شاید میری اس بات پر یقین نہ کریں، لیکن حقیقت یہی ہے، کیونکہ مدارس کی طرز تعلیم یہ ہے کہ ایک حرف پر علمائے کرام کو دس جگہ دماغ دوڑانا پڑتا ہے مثلاً جو لفظ پڑھا، وہ مفرد ہے یا مرکب؟ موضوع ہے یا محمول؟ مبنی ہے یا معرب؟ منصرف ہے یا غیر منصرف؟ جمع ہے تو کون سی؟ زبر، زیر، پیش ہے تو کیوں؟ مضاف ہے یا مضاف الیہ؟ عبارت پوشیدہ ہے تو قرینہ کیا ہے؟ حالیہ ہے یا مقالیہ وغیرہ، اور وہاں صرف دماغ اس پر چلانا ہے جو سامنے درج ہے، اگر کوئی مخلص فرد کوئی ایسا انسٹی ٹیوٹ تیار کر دے جہاں علما بعد فراغت ایک یا دو سالہ کورس ماہرین کی زیر نگرانی رہ کر پڑھیں، تو بہت جلد ایک انقلابی صورت علما اور امت مسلمہ کو نظر آئے گی۔ اسے بھی دینی امور کار خیر شمار کیا جائے گا۔

خیر آمدم بر سر مطلب! شیخ صاحب کی توجہ اس امر کی طرف تین چار سال پہلے ہی چلی گئی اور انہوں نے اس پر عمل درآمد کیا۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے، مگر اس کی شدید ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب سپریم کورٹ نے طلاق، حلالہ، تعدد ازواج پر سماعت کے لیے عرضی قبول کرتے ہوئے بڑی سرعت کے ساتھ اپنا فیصلہ بھی صادر کر دیا۔ میں ورطہ حیرت میں ڈوب گیا جب مسلم پرسنل لا کی جانب سے ایک غیر مسلم " کپل سبل" کو وکیل نامزد کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جسے اسلام سے نسبت نہیں، اسلام کی تعلیمات سے آ گاہی نہیں، وہ شریعت کا تحفظ کیا کرے گا؟ اور کیوں کرے گا؟ اس نے تو قرآن وحدیث کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہہ دیا کہ جس طرح رام مندر آستھا (عقیدت) کا مسئلہ ہے، اسی طرح حلالہ، طلاق ثلاثہ، تعدد ازواج بھی اسلامی عقیدت سے جڑا معاملہ ہے، اس کو نہ چھیڑا جائے۔ تین طلاق قرآن وحدیث سے ثابت نہیں، بلکہ منع ہے۔ کیا کورٹ اس دلیل کو قبول کر لے گا؟

جب ہمارے اپنے علما وکیل ہوں گے تو اپنی دلیل ہوگی، دل میں کرب ہوگا۔ شریعت کے تحفظ کا جو درد ایک عالم کے سینے میں ہوتا ہے، وہ کسی اور کے سینے میں کہاں ہوگا؟ اور اگر ہو بھی تو ہمارے مسلم وکلا کو شریعت کی سمجھ کتنی؟ اس لیے علمائے کرام کو آگے بڑھ کر خود مورچہ سنبھالنے کی ضرورت ہے۔ یہ وکلا بھی کار خیر کر سکتے ہیں مثلاً بے گناہ مسلم نوجوانوں کے کیس لڑ کر انھیں بری کرائیں، دہشت گردی کے نام پر ہونے والے افراد کے کیس نہ تو کوئی لڑنے کو تیار ہوتا ہے، نہ ہی کسی وکیل کو لڑنے دیا جاتا ہے، بلکہ راجستھان ولکھنؤ کورٹ میں تو یہاں تک ہوا کہ جو لوگ بھی ایسے کیس لڑنے کو تیار ہوئے تو ان کے ساتھ مار پیٹ کی گئی۔ یہ علمائے کرام جہاں کہیں بھی رہیں گے، کم از کم اس علاقے کے ایسے غریب ونادار افراد کے ایک ایک کیس کو بھی اگر ہینڈل کر لیں تو بہت کچھ بدلے گا۔ ابھی تقریباً چھ ماہ پہلے کا واقعہ ہے کہ ہمارے یہاں ضلع جج نے ایک غیر مسلم شخص کے قتل کے معاملے میں 18: افراد کو عمر قید کی سزا سنائی ہے۔ وکلا نے پیسہ بھی خوب لیا اور نتیجہ بھی صفر۔ جو ملوث تھے، وہ بھی اور جو نہیں تھے، وہ بھی سزا پائے۔ کاش مسلم اخوت ومودت کا سبق پڑھنے والے علمائے کرام ہوتے تو نتیجہ کچھ اور ہوتا۔

بدلتے وقت کے ساتھ علمائے کرام کی ذمہ داریاں بھی بڑھی ہیں اور نئی راہیں بھی کھلی ہیں۔ علی گڑھ میں سید امان میاں قادری برکاتی کے زیر اہتمام علما کے لیے دو سالہ کورس ماہرین اساتذہ کی دیکھ ریکھ میں جاری ہے، جہاں انھیں انگلش، عربی اور اردو صحافت کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کے استعمال اور ٹیچنگ کی باریکیوں اور کوچنگ سینٹر کے ذریعے حصول معاش کی ترغیب دی جارہی ہے، وہیں علمائے کرام کے لیے دین کے ساتھ دنیاوی ضروریات کی تکمیل کی خاطر نئی راہیں بھی کھل رہی ہیں۔

ائمہ اسلام تو بہت پہلے کہہ گئے کہ اپنے اطبا پیدا کرو۔ غیر مسلم معالج اہم مسلمانوں کو اپنے علاج کے ذریعے ہی مارتے ہیں، نیز قرآن مجید میں رب تعالیٰ کا فرمان ہے: "**لاتتخذوا بطانة من دونكم لا يألونكم خبالا** "یعنی کافروں ومشرکوں کو اپنا راز دار نہ بناؤ، وہ تمہارا برا ہی چاہیں گے۔ "**ولم يتخذوا من دون الله ولا رسوله ولا المؤمنين وليجة** "اللہ ورسول اور مسلمانوں کے علاوہ کو دخیل کار نہ بناؤ۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث ہے: "**لا تستضيؤا بنار المشركين** "مشرکین کی آگ سے روشنی نہ لو۔ ان سے دور رہنے کے لیے یہی آیات وحدیث کافی ہیں، پھر انھیں اپنی جان کا معاملہ سپرد کر دینا اس سے زیادہ دوست بنانا اور کیا ہو سکتا ہے؟

امام محمد عبدری بن الحاج مکی قدس سرہ میں فرماتے ہیں: "**وأشـد القبـح واشنع ما ارتكبه بعض الناس فى هذا الزمان من معـالـجة الطبيب والكحال الكافرين الذين لا يرجى منهما النصح ولا خيربل يقطع بغشهما واذيتهما لمن ظفرا به من المسلمين سيما ان كان المريض كبيرا في دينه أو علمه**" (المدخل)

یعنی سخت ترقبیح وشنیع ہے وہ جس کا آجکل بعض لوگ ارتکاب کرتے ہیں یعنی کافر طبیب اور سنیے سے علاج کراتے ہیں۔ وہ تمہارا بھلا کبھی نہ چاہیں گے، بلکہ اذیت وتکلیف ہی چاہیں گے، خصوصاً جب مریض معظم دینی یا علم والا ہو، پھر فرماتے ہیں کہ وہ مریض کو کھلے ضرر کی دوا

نہیں دیتے۔ یوں تو ان کی روزی میں خلل پڑے، دوکان بند ہو جائے، بلکہ ایسی دوا دیتے ہیں کہ بسا اوقات مریض جلدی اچھا ہو جاتا ہے، لیکن جب جماع کرے تو مرض عود کرتا ہے۔ کبھی مریض اچھا ہو جاتا ہے، مگر جب غسل کرتا ہے تو مرض پلٹ آتا ہے۔ کبھی سال دو سال بعد مرض عود کرے، ایسی دوا دیتے ہیں۔ بہر صورت احتیاط لازم ہے، کیوں کہ ساری عداوتیں ختم ہو جاتی ہیں، دینی عداوت نہیں جاتی۔

پھر علامہ عبدری مکی اپنے زمانے کے ایک معتمد ثقہ راوی سے ایک رئیس کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ مصر میں ایک رئیس کا یہودی طبیب تھا۔ رئیس نے اسے کسی وجہ سے نکال دیا۔ رئیس بیمار ہوا، لوگ اسی کو اصرار کر کے بلا لائے۔ مجھے بھی خبر کی، میں پہنچا تو دیکھا کہ اس نے رئیس کا کام تمام کر دیا۔ وہ بولا کہ کل صبح رئیس کا انتقال ہو جائے گا اور وہی ہوا۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ علیل ہوئے۔ ایک یہودی معالج تھا۔ اچھے ہو جاتے، پھر مرض عود کرتا۔ کئی بار ایسا ہی ہوا۔ آپ نے طبیب کو بلایا۔ چپکے سے پوچھا۔ سچ بتا، کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا کہ آپ سچ پوچھتے ہیں تو سنئے۔ ہمارے لیے اس سے بڑا کوئی ثواب کا کام نہیں کہ آپ جیسے امام کو مسلمانوں سے کھودوں۔ آپ نے اسے دفع کیا۔ بفضلہٖ تعالیٰ شفا پائی، پھر آپ نے طب کی طرف رجوع کیا اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اپنے طلبہ کو ماہر طبیب بنا دیا اور اعلان کیا کہ مسلمان کسی کافر سے علاج نہ کرائیں۔

ہر دلعزیز فلسطینی صدر یاسر عرفات کی موت ڈاکٹروں کے ذریعے ہی ہوئی تھی۔ حال ہی میں ہمارے کریم و شفیق استاد محترم جناب مفتی رحمت اللہ صاحب قبلہ بلرام پوری بھی غیر مسلم ڈاکٹروں کی سازش کے شکار ہو چکے ہیں۔ حضرت نے بتایا کہ جب ڈاکٹر نے ملاقات کرنے والوں کی کثرت دیکھا تو اس نے بھانپ لیا کہ یہ مسلمانوں کی کوئی بڑی ہستی ہے تو اس نے جان بوجھ کر کیس بگاڑا اور پیسہ بھی خوب لیا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں صرف مسلم وکلا ہی نہیں، بلکہ ڈاکٹر، انجینئر، آئی اے ایس، آئی پی ایس آفیسرز بھی چاہیے۔ ہر محاذ پر ہمیں اپنے لوگوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، لیکن اپنے لوگ دستیاب نہیں۔ کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ اب ہمیں انہی خطوط پر آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ شیخ ابوبکر باقوی کے آثار و نشانات پر سربراہان قوم کو غور و فکر کی توفیق عطا فرمائے: آمین بجاہ النبی الکریم علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والتسلیم

دنیا کی امیر ترین خواتین ایک نظر میں

امجدی بانو بنت مفتی عبدالقادر رضوی باسنی (ناگور) کلاس: ہشتم: چاند شہید اسکول باسنی ناگور (راجستھان)

آپ دنیا کی امیر مرد شخصیات کا ذکر تو اکثر پڑھتے ہیں جن میں سرفہرست مائیکروسافٹ کا بانی بل گیٹس ہے۔ آج ہم آپ کو دنیا کی امیر ترین مسلم خواتین کے بارے میں بتائیں گے جو مختلف شاہی خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ اپنی کمپنیوں کی مالک ہیں، یا پھر ان کے فیملی بزنس ہیں جن کی مالیت کئی ارب روپے ہے۔

ملکہ رانیہ آل عبد اللہ :

یہ اردن کی ملکہ اور تقریباً تین ارب ڈالر مالیت کے اثاثے رکھنے والی ملکہ ہیں۔ یہ اثاثے بنیادی طور پر یہ ان کے شوہر، شاہ عبداللہ دوم کے ہیں۔ رانیہ کی مقبولیت کی بڑی وجہ تعلیم، صحت اور سماجی کاموں میں ادا کیا جانے والا مرکزی کردار ہے اس کے علاوہ رانیہ فیشن کی بہترین سمجھ بوجھ رکھنے والی خاتون کے طور پر بھی جانی جاتی ہیں۔

شہزادی سلمیٰ بنانی :

یہ مراکش کے بادشاہ، محمد چہارم کی اہلیہ ہیں اور ایک اندازے کے مطابق ان کے اثاثے کی مالیت ڈھائی ارب ڈالر سے بھی زائد ہے

۔اس کا مطلب یہ ہے کہ سلمٰی بنانی روزانہ بآسانی نولاکھ ساٹھ ہزار ڈالرخرچ کرسکتی ہیں ۔شہزادی کی خاصیت یہ ہے کہ ان کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ان کے والدایک استاد تھے،لہٰذاشہزادی سلمٰی مراکش میں غربت دور کرنے کے لیے بہت سرگرم ہیں ۔

شهزادی امیره الطویل :

سعودی عرب سے تعلق رکھنے والی شہزادی امیرہ الطّویل کا شمارا امیر ترین مسلم خواتین میں ہوتا ہے۔آپ الولید بن طلال فاؤنڈیشن کی وائس چیئر پرسن بھی ہیں اورانہیں مشرق وسطیٰ کی بااثر خواتین میں شمار کیا جاتا ہے۔امیرہ سعودی عرب کے شہزادہ الولید بن طلال کی بیوی تھیں ۔ دنیائے اسلام کی یہ امیر ترین شخصیت سعودی شاہی خاندان کا رکن ہے ۔وہ الولید بن طلال فاؤنڈیشن کی وائس چیئر پرسن کے طور پہ دنیا سے جہالت وغربت دور کرنے کی خاطر سرگرم عمل ہیں ۔

شیخیه حنادی ناصر :

شیخیہ حنادی کا شمار قطر کی کامیاب ترین کاروباری خواتین میں ہوتا ہے ۔ یہ اموال نامی کمپنی کی بانی اور چیئر پرسن ہیں ۔شیخیہ کئی کمپنیوں کی سرپرستی کے فرائض انجام دے رہی ہیں ۔ایک اندازے کے مطابق ان کے خاندان کے اثاثہ جات کی مالیت کئی ارب ڈالر ہے ۔

شهزادی حاجبه صالحه:

یہ برونائی کی ملکہ ہیں اوراپنے پرنعش طرز زندگی کی وجہ سے دنیا بھرمیں مشہور ہیں ۔آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس امیر ترین ملکہ کی شادی پربیس ملین ڈالر سے زائد کی رقم خرچ کی گئی تھی ۔سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کی حصہ لیتی ہیں ۔

شهزادی میثاء:

یہ کھیلوں کی دنیا میں سرگرم امیر ترین خاتون ایتھلیٹ سمجھی جاتی ہیں اوران کے اثاثون کی مجموعی مالیت کئی ارب ڈالر ہے ۔ یہ متحدہ عرب امارات کے وزیراعظم اورنائب صدر، شیخ محمد بن الراشد مکتوم کی صاحبزادی ہیں ۔

سال ۲۰۰۶ء میں بلند حوصلہ شہزادی میثاء ایشین گیمز سلور میڈل اپنے نام کرچکی ہیں ۔

سلطانه نور زاهره :

یہ ملائیشیا کی ریاست تیرنگانو (Tere Ngganu) کے بادشاہ ،سلطان میزان زین العابدین کی اہلیہ ہیں اوران کے اثاثوں کی مالیت پندرہ ارب ڈالر سے زائد ہے ۔ یہ اپنے فلاحی کاموں کے حوالے سے بے پناہ مقبولیت رکھتی ہیں ۔اس وقت سلطان زین العابدین یونیورسٹی کی وائس چانسلر ہیں ۔

شهزادی موزا بنت ناصر المسند

قطر سے تعلق رکھنے والی شہزادی موزا بنت ناصر المسند کا شمار دنیا کی بااثر خواتین میں کیا جاتا ہے ۔ یہ قطر کے سابق امیر شیخ حماد بن الخلیفہ کی دوسری بیوی ہیں ۔ان کے اثاثوں کی مالیت سات بلین یورو ہے ۔ یہ قطر میں تعلیم کے حوالے سے بہت سرگرم ہیں اور سماجی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتی ہیں ۔

یہ وہ آٹھ مسلم خواتین ہیں جن کا نام دنیا کی امیر ترین خواتین میں درج ہے،لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ انھوں نے محض اپنی امارت کے ذریعہ نام نہیں کمایا، بلکہ سماجی خدمت کو بھی جاری رکھا اورامارت کے علاوہ سماجی خدمات کی وجہ سے بھی شہرت پائیں ۔ ☆☆☆

ہمارے افکار وخیالات

طارق انور مصباحی (کیرلا)

10: شوال المکرّم کو ملک ہند میں جابجا امام اہل سنت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز کا یوم ولادت منا کر آں مجدد اعظم علیہ الرحمۃ والرضوان کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ان کی سیرت وسوانح کو بیان کیا جاتا ہے،تا کہ ماوشما اپنے ہر دلعزیز رہنما کے نقش قدم کو اپنے لیے معیار بنالیں۔ یہ طریق کار اسلاف کرام سے چلا آ رہا ہے،لیکن عہد حاضر میں ایک بات بڑی شدت سے محسوس کیے جانے کے قابل ہے کہ امام موصوف نے شرعی امور کے ساتھ سیاسی،سماجی اور مسلمانوں کے معاشی امور کے لیے رہنما خطوط اپنے فتاویٰ اور کتب ورسائل میں تحریر فرمائے۔آج مذہبی رہنماؤں نے خود کو شرعی امور تک محدود کر لیا ہے۔جب ہمارے آئیڈیل قائد نے ہر ضروری امر میں قوم کی رہنمائی فرمائی ہے تو ہمارا خود کو محض شرعی امور کی قیادت تک محدود کر لینا یقیناً ان کے طریق کار سے انحراف کرنا ہے۔

اسی طرح یہ فکر وخیال بھی اکثر قلوب واذہان میں رچ بس گئے ہیں کہ جو کام کرنا ہے،وہ اکابرین ملت ہی انجام دیں،حالانکہ جو کوئی کار خیر انجام دے گا،اللہ تعالیٰ اسے اجر عطا فرمائے گا،خواہ وہ اکابرین میں سے ہو یا اصاغرین میں سے یا عام مسلمین میں سے۔حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے ایک عظیم الشان تعلیمی ادارہ ''الجامعۃ الاشرفیہ'' تعمیر فرمائی۔اس وقت بھی وہ عظیم شخصیتیں باحیات تھیں،جن کو خود حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان اپنے اکابرین میں شمار فرماتے تھے۔جامعہ اشرفیہ (مبارک پور) کے سنگ بنیاد کے اجلاس میں بہت سے اکابرین مدعو تھے،وہ شریک ہوئے اور سبھوں نے حافظ ملت کی تائید ومعاونت فرمائی۔کسی نے یہ نہ فرمایا کہ یہ کام موجودہ اکابرین میں سے ہی کوئی انجام دے۔آج دیوبند وندوہ کے بالمقابل ہم جامعہ اشرفیہ (مبارکپور) کو اپنی جانب سے پیش کرتے ہیں اور ہمارا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔

جس کسی اہل خیر کے پاس کچھ کارنامہ کرنے کی وسعت وگنجائش موجود ہو،وہ ضرور اقدام کرے۔اس طرح بہت سے قومی وملی کام سرانجام پاسکتے ہیں۔اکابرین بھی اپنے طور پر دینی وملی خدمات میں مصروف عمل رہتے ہیں۔اب ہمیں بھی اپنی قوت ووسعت کے مطابق عملی تحریک کا حصہ بن جانا چاہئے۔امام اہل سنت نے اپنے منظوم رسالہ ''الاستمداد'' میں اپنے تلامذہ،خلفا وعلمائے اہل سنت کی خدمات کا چرچا فرمایا،ان حضرات کی تحسین فرمائی اور انہیں دعائیں بھی دی ہیں۔اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اکابرین اپنے اصاغرین کے کارناموں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور قومی وملی خدمات پر انہیں قابل مدح قرار دیتے ہیں اور یہی ہونا بھی چاہئے،تا کہ اصاغرین کی حوصلہ افزائی ہو۔

شخصیت سازی کا مہلک مرض بھی طاعون جارف کی طرح ہمیں اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔اپنے نفس سے جہاد کے لیے ہمیں کفن بردوش ہو جانا چاہئے۔یہ ایک عظیم جہاد ہے۔ہم نے خود احتسابی اور نفس کشی کی جانب توجہ دینا ترک کر دیا،جس کے سبب بہت سے قومی وملی کام بھی نہ ہو سکے اور ہمارا باطن بھی اخلاق فاضلہ اور اعلیٰ کرداروں سے خالی ہو گیا۔اگر ہمارے چند حاشیہ بردار ہماری تعریف وتوصیف اور مدح سرائی کرتے ہیں تو اس سے قوم کو کیا فائدہ؟ بلکہ اس میں ہمارا بھی کچھ اخروی فائدہ نظر نہیں آتا۔بات یہیں تک محدود ہوتی تو بھی کچھ زیادہ نقصان نہ ہوتا،لیکن ہم نے اپنے آپ کو اچھا ثابت کرنے اور اپنے دوسرے بھائیوں کی تقبیح وتذلیل کرنے کی رسم بد بھی ایجاد کر لی۔ذرہ کو پہاڑ اور پہاڑ کو ذرہ بنانے کا ہنر ہم نے خوب سیکھا ہے۔سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کب تک ثابت کیا جا سکتا ہے۔آخر کار حقیقت آج یا کل منکشف ہو کر رہے گی۔ہماری فکر کو کسی کی نظر بد لگ گئی کہ ہم نہ اچھا سوچ سکتے ہیں،نہ اچھا کر سکتے ہیں۔ہمارا قلب عشق مصطفوی سے معمور ہونا چاہئے تھا،لیکن وہ اب غلامان دربار اعظم کے بغض وحسد سے بھرپور ہو چکا ہے:سوچو! ہم کہاں جا رہے ہیں؟ کیا ہے کوئی جو میری آواز سنے؟

R.N.I. No. DELURD/2015/65657
Publishing Date:20
Same Month

Postal Registration DL(DG-11) 8085/2016-18
Total 56 Pages with Title Cover, Weight 95 grams
Posting Date: 21&22

Paigam e Shariat Monthly

Vol: 04 Issue:33 JULY-2018

صدسالہ عرس رضوی کے موقع پر

ماہنامہ پیغام شریعت دہلی کی طرف سے

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ العزیز پر خصوصی شمارہ

آئندہ ۲۵ صفر المظفر ۱۴۴۰ھ کو عرس رضوی صد سالہ عرس کے طور پر منایا جارہا ہے، جس کی تیاریاں زور وشور سے جاری ہیں۔ اہل سنت وجماعت کی تنظیمیں مختلف علاقوں میں اعلیٰ حضرت سے متعلق سیمینار، جلسے، اور دیگر پروگرام کی تیاری میں ہیں، اور متعدد رسالے اور جریدے خصوصی شمارے ترتیب دے رہے ہیں، ہم ان تمام کاموں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ماہنامہ پیغام شریعت دہلی ان تمام کاموں اور منصوبوں کو قارئین تک پہنچانے کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کو تیار ہے، اپنے اعلانات اور تفصیلات ہمارے ای میل پر ارسال کریں تو ہم اگلے شماروں میں اسے شائع کر سکتے ہیں۔

نیز ادارہ پیغام شریعت دہلی تمام اہل سنت سے گزارش کرتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کی ہمہ گیر عظیم علمی ودینی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے جو کچھ بن پڑے ضرور کریں۔

اس موقع پر ادارہ پیغام شریعت دہلی ایک ضخیم خصوصی شمارے پر کام کر رہا ہے۔ جو حضرات تحریری خدمات پیش کر سکتے ہیں وہ خصوصی شمارے کی تفصیلات کے لیے درج ذیل نمبر پر رابطہ کریں۔ یا ای میل پر رابطہ کریں۔

مولانا فیضان المصطفیٰ قادری امریکہ (واٹس ایپ) +18326067598
مولانا کوثر امام قادری مہراج گنج 09838086342
ڈاکٹر سجاد عالم رضوی کلکتہ 08697131995
مولانا طارق انور مصباحی کرالا 09916371192
ڈاکٹر امجد رضا امجد پٹنہ 09835423434
ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی ممبئی 09869328511
مولانا اعجاز عنبر مصباحی دہلی 09679583583
مولانا ازہار احمد ازہری بستی 09936691051
مولانا حسان المصطفیٰ قادری گھوسی 08604443188
مولانا ریاض المصطفیٰ کراچی +923212578612

Email: Paighameshariat@gmail.com

Owner, Publisher & Printer
Mohammad Qasim

Chief Editor
Faizanul Mustafa Qadri

Printed at **M/s Ala Printing Press**
3636 Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006
Published from H.No.422, 2nd Floor, Gali Sarotey wali,
Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-110006